جے پور کے پوتر پاپی





ایک مجاہد کی جذبہ اسلام سے سرشار جرأت آموز سچی داستان

جے پور کے پوتر پاپی

ابو جواد

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰-عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور ـ فون ۷۲۴۷۴۱۴

چند ماہ قبل میں اپنے آفس میں بیٹھا بعض ضروری کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھا۔ سہ پہر کے تین ساڑھے تین بجے ہوں گے۔ دفتر میں دو بجے چھٹی ہو چکی تھی اور زیادہ تر سٹاف جا چکا تھا۔ مگر میں اپنے ذمے معاملات کو اسی روز نپٹانے کا تہیہ کیے ابھی تک کام میں مصروف تھا۔ اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دوپہر کے وقت چتوکی سے میرے بڑے بھائی حاجی شوکت علی تشریف لے آئے تھے۔ کچھ دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی رخصت ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں حسب معمول کام میں مصروف ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ تھا اور باہر شدید گرمی تھی۔ میری خواہش تھی کہ دھوپ کی حدت کچھ کم ہو تو گھر کے لیے نکلوں' تب تک کچھ کام بھی نپٹ جائے گا۔

اسی دوران باہر سے ہلکی سی دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھول کر ایک صاحب اندر داخل ہو گئے۔ درمیانی قد و قامت کا وہ شخص پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ چہرے پر موجود سفید داڑھی نے اس کی شخصیت کو خاصا پُروقار بنا دیا تھا۔ میں اس کے احترام میں اپنی نشست سے ہلکا سا اٹھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ شخص میرا بڑھا ہوا ہاتھ نظرانداز کرتے ہوئے کھڑے کھڑے کچھ دیر مجھے بغور دیکھتا رہا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے وہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

اس کے رویے سے میں کسی قدر حیران سا تھا اور اسے پہچاننے کی پوری کوشش کر رہا تھا' مگر کوشش کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ میں ان صاحب سے کہاں مل چکا ہوں؟ وہ

خاموشی سے بیٹھا غالباً میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال کچھ دیر قائم رہی۔

تبھی میں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے گویا اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ "جناب! میں کوشش کے باوجود آپ کو پہچان نہیں سکا۔ ویسے لگتا ہے ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔"

وہ شخص ایک باوقار مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ "یار! تم نے تو یہ بات بالکل صحیح ثابت کر دی کہ جیل اور ریل کی یاری انتہائی ناپائیدار ہوتی ہے۔" اس کے منہ سے یہ سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے کہا۔ "آپ کی آواز کافی جانی پہچانی لگ رہی ہے' مگر میں.........."

وہ میری بات اچکتے ہوئے بولا۔ "چھوڑو یار! تمہاری تحریروں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت غیر معمولی ہے لیکن اب پتہ چلا کہ حافظے کے معاملے میں بالکل پیدل ہو۔"

اس کی حد سے بڑھتی ہوئی بے تکلفی مجھے خاصی ناگوار گزری تھی مگر اس کے پُراعتماد لب و لہجے نے مجھے کسی ردِعمل کے اظہار سے روک رکھا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا اور پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے تم "الور" جیل کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہو۔ شاید اسی لیے اب تک تمہاری کسی تحریر میں اس کا تذکرہ نہیں آیا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی میرے ذہن پر چھائی ساری دھند یکبارگی چھٹ گئی تھی۔ "آپ غالباً مراد صاحب ہیں؟" اس پر وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "غالباً نہیں مسٹر ابو جواد! میں یقیناً مراد ہی ہوں۔ وہی مراد تاش کھیلتے ہوئے آپ جس کے پارٹنر ہوا کرتے تھے۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کا چکر کاٹ کر اسے جا لپٹا۔ وہ بھی انتہائی گرمجوشی سے گلے ملا تھا۔

کتنی ہی دیر ہم دونوں کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا تھا' البتہ دونوں کی

آنکھوں کے گوشے ہلکے سے بھیگ گئے تھے۔ شاید انتہائے غم کی طرح وفورِ مسرت سے بھی دل پگھل کر آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔

اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کے بعد بھی ہم دونوں کتنی ہی دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے ہی خاموشی کا یہ دورانیہ ختم کیا۔ "مراد صاحب! آپ کا تو حلیہ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارے حضرت! خود پر بھی تو نظر ڈالیے' اس معاملے میں آپ بھی زیادہ پیچھے نہیں رہے۔"

میں نے چوکیدار کو بلا کر کچھ کھانے پینے کے لیے منگوایا۔ اس کے بعد بات چیت کے دوران ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب سائے ڈھلے اور شب کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ میں نے مراد سے پوچھا تھا۔ "آپ کو میرا ایڈریس کہاں سے مل گیا جو ڈھونڈتے ہوئے سیدھے یہاں تک پہنچ گئے؟"

وہ اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ڈھونڈنے نکل پڑو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اس کا طویل جواب مکمل ہونے کے بعد میں نے پوچھا۔ "یہ ابھی آپ نے بوسنیا کا ذکر کیا تھا مراد بھائی! وہاں کیا کر رہے ہیں اور آپ نے راحت بھابی کے متعلق کچھ نہیں بتایا کہ وہ کس حال میں ہیں؟" یہ سنتے ہی جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ارے بھئی! یہ افسانے نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے۔ باقی رہا تمہاری راحت بھابی کا معاملہ تو برخوردار! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ "راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔"

میں اس کی جانب قدرے متحیر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "مراد بھائی! یہ آپ ہی بول رہے ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آپ تو عشق ہی کو مقصدِ حیات قرار دیا کرتے تھے مگر آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ چوکیدار کمرے میں داخل ہوا۔ "سر! رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو کینٹین سے رات کا کھانا لے آؤں؟" وہ غالباً ہمیں یہ

احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہمارا دفتر سے اٹھنے کا ارادہ بھی ہے یا رات یہیں بسر کرنے کا موڈ ہے۔

کچھ دیر بعد ہم دفتر سے نکل رہے تھے۔ "چلیں مراد بھائی! گھر چلتے ہیں۔ وہیں مزید باتیں ہوں گی۔" وہ بولا۔ "نہیں یار! گھر ضرور چلیں گے مگر آج نہیں۔ ابھی تو تم میرے ساتھ ہوٹل چلو جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یا پھر ایسا کرتے ہیں یہیں نہر کے کنارے کسی جگہ بیٹھ کر ایک دوسرے کی رام کہانی سنتے ہیں۔"

ہم نے یونیورسٹی مین کیفے سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کچھ دوری پر نہر کے کنارے جا بیٹھے۔ وہ مجھ سے میرے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ بیچ میں جب بھی میں نے اس کی بیوی راحت کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے لگا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار نہیں۔

اس کا رویہ دیکھ کر میرے اندر تجسس بڑھتا گیا۔ جب میں نے تیسری چوتھی بار وہی بات چھیڑی تو وہ سپاٹ سی آواز میں بولا۔ "چھوڑو یار! راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو اب کیوں ہوا دیتے ہو۔ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں گے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں اور بچھڑی ہوئی امیدوں کے تذکرے سے کچھ بھی حاصل ہوا ہے؟"

میں کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ "کیا مطلب؟ کیا خدانخواستہ راحت بھابی دنیا میں نہیں رہیں؟" وہ جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "خدا نہ کرے ایسا ہو۔ وہ حیات ہے اور غالباً ٹھیک ہی ہو گی۔" اس کے جواب نے میرے اندر عجیب سی سنسنی پیدا کر دی تھی۔

میرے مزید اصرار پر اس نے ساری تفصیل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بیان کر دی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب ہم وہاں سے اٹھے۔ وہ اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا اور میں نے گھر کی راہ لی۔

بستر پر لیٹنے کے بعد نیند کوسوں دور تھی۔ ذہنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ متضاد

خیالات نے ذہن میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یادوں کی اس بارات میں نیند بھلا کیسے آتی ہے۔ میرا طائرِ خیال مجھے انیس برس پیچھے لے گیا جب مراد سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو مجھے سپیشل کورٹ سے پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے "بے بنیاد" الزام کے تحت طویل قید با مشقت کا حکم سنایا جا چکا تھا جس کے بعد میں فرار ہونے کی کوشش کے بعد بھرت پور کے قریب دوبارہ گرفتار ہو چکا تھا اور کئی تکلیف دہ مراحل اور وادیِ تفتیش کی بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد جے پور جیل میں تھا۔

اس دوران بھارت میں ایمرجنسی نافذ کی جا چکی تھی اور تمام تر بھارتی اپوزیشن کی صف اول کی قیادت سمیت لاکھوں کارکن گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس وجہ سے تمام جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی بند تھے اور جیل کو نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اس مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بھارت سرکار نے اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ بھارت کے طول و عرض میں مختلف الزامات کے تحت گرفتار پاکستانیوں کو کسی ایک جیل میں اکٹھا کر دیا جائے تاکہ ان سے متعلقہ انتظامی مسائل بہتر ڈھنگ سے نپٹائے جا سکیں۔

اس حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اس مقصد کے لیے قرعہ فال الور جیل کے نام پڑا اور سبھی پاکستانیوں کو وہاں ٹرانسفر کرنے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔

دہلی سرکار کے اس نادر شاہی حکم کی سرتابی کی مجال بھلا کسے ہوتی' لہٰذا ایک ماہ کے اندر ہی چار سو کے لگ بھگ پاکستانی شہریوں کو الور منتقل کر دیا گیا۔ مجھے بھی جولائی کی تیرہ تاریخ کو الور روانہ کر دیا گیا۔ میرے ساتھ بھلوال سرگودھا کے میاں محمد خان' بہاولنگر کے گاؤں "کھاناں" کے انور ماچھی اور فورٹ عباس کے اللہ یار بھٹی کے لیے بھی یہی حکم دیا

گیا تھا۔

ہم چاروں اس فیصلے سے خاصے خوش تھے کہ سبھی ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا موقع ملے گا اور اس طرح شاید اسیری کی تلخیوں میں کسی حد تک کمی واقع ہو سکے۔ الور' راجستھان کے شمال مشرق میں آخری ضلع ہے۔ جس کے بعد صوبہ ہریانہ کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے دہلی ہے۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کا موسم گرمیوں میں خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔

شہر سے قریب دو میل کے فاصلے پر الور جیل واقع ہے۔ یہ علاقہ ویران سا ہے۔ جیل دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دیوار کی جانب پرانی جیل کی عمارت تھی جس میں آٹھ چھوٹی بیرکیں تھیں۔ فصیل کے دوسری طرف کچھ سال پہلے جیل کی نئی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں بھی آٹھ بیرکیں اور دو احاطے تھے۔ بیرک نمبر ۱۵ تا ۱۸ ایک احاطے میں جبکہ ۱۹ تا ۲۲ دوسرے میں تھیں۔

نئی اور پرانی جیل کے درمیان ۲۰ فٹ بلند اور چار فٹ چوڑی دیوار تھی۔ ایک کاسنی رنگ کا بڑا سا آہنی پھاٹک دونوں جیلوں کو ملاتا تھا۔ جیل کے مرکزی گیٹ کے باہر چار چھوٹی بیرکوں پر مشتمل الگ حصہ تھا جسے کبھی زنانہ جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا مگر اب اسے کال کوٹھڑیوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ عام طور پر جیل کے اندر ہی کال کوٹھڑیاں ہوتی ہیں مگر الور جیل اس لحاظ سے ذرا منفرد نوعیت کی حامل تھی۔

ہم چاروں سہ پہر چار بجے مسلح گارڈ کی معیت میں جیل ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ضروری اندراج کے بعد سپرنٹنڈنٹ کا حکم ہوا کہ فی الحال انہیں بیرونی زنان خانے میں رکھا جائے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ سن کر قطعی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہم تو اس امید پر یہاں آئے تھے کہ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے......" مگر وہاں ہماری خوشی یا ناخوشی کی بھلا کسے پروا تھی۔ بیڑیوں سمیت فوراً ہی کال کوٹھڑیوں میں پہنچا دیئے گئے' البتہ وہاں ہمیں صرف دو راتیں گزارنا پڑیں۔

اگلے ہی روز ڈیوٹی حوالدار شمبھو دیال نے ہمیں آکر خوشخبری سنائی کہ تم چاروں کو پاکستانی وارڈ میں بھیجنے کا آرڈر (حکم) آگیا ہے۔ ہم نے فوراً ہی اپنا بوریا بستر (جو ایک عدد دری اور کمبل پر مشتمل تھا) سمیٹا اور حوالدار موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی راہنمائی میں جیل ڈیوڑھی کی جانب چل پڑے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے چیف ہیڈ وارڈن کے دفتر پہنچائے گئے۔

ہم چاروں پاکستانی حصے میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے دل کی سبھی مرادیں بر آئی ہوں۔ جب ہم چاروں پاکستانی حصے میں داخل ہوئے تو سبھی لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں یوں مل رہے تھے جیسے ہم بڑی اہم شخصیات ہوں۔ اس غیر معمولی احترام کی فوری وجہ تو ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ ہمیں اپنے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہ تھی بلکہ "من آنم کہ من دانم" والا معاملہ تھا لیکن بھلا عزت کسے اچھی نہیں لگتی' لہٰذا ہم چاروں بھی وقتی طور پر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے اور اپنی تمام تکلیف بھلا بیٹھے تھے۔

ہم چاروں کو ۱۵ نمبر بیرک میں جا کر ٹھہرایا گیا۔ وہاں موجود اکہری شخصیت کے مالک ایک صاحب نے اپنے ساتھی کو ہمارے لیے چائے بنانے کا کہا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ شخص یہاں خاصی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

میاں محمد خان نے اس کی طرف استفہامیہ نگاہیں اٹھائیں تو ان کا مدعا بھانپ کر وہ جوان عمر شخص گویا ہوا۔ "میرا نام سید توسل حسن ہے اور میں پاکستانی پنجاب کے ضلع لیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔"

اس شخص کا لہجہ انتہائی شائستہ تھا۔ مزید بات چیت سے اندازہ ہوا کہ موصوف کو گفتگو کا سلیقہ آتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے بھارت اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا اور اس جرم کی پاداش میں ایک سال کی سزا بھگت چکا ہے اور اب "ڈیفنس آف انڈیا رولز" کے تحت نظر بند ہے۔ میاں محمد اس کو بغور دیکھتے ہوئے

بولا۔ "سزا ختم ہونے کے بعد بھی آپ کو وطن کیوں نہیں بھجوایا گیا؟"

توسل شاہ اپنے مخصوص اور سنجیدہ انداز میں بولا۔ "محمد خان جی! میں ہی نہیں یہاں موجود تین سو سے زائد افراد اپنی سزائیں کاٹ چکے ہیں۔ ان میں پچاس سے زائد عورتیں اور بچے بھی ہیں اور سبھی دہلی سرکار کے نادر شاہی حکم کے تحت نظر بند ہیں۔ سرکار کا کہنا ہے کہ مناسب وقت پر تمہیں پاکستان بھجوا دیا جائے گا۔" مزید استفسار پر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں اصل پاکستانی تو ساٹھ ستر سے زائد نہیں باقی سبھی خواتین و حضرات بنگلہ دیشی یا بہاری ہیں جو پاکستان جاتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ بھارتی پولیس نے اپنے کاغذات میں انہیں پاکستانی شہری قرار دے کر جیل بھجوا رکھا ہے۔

یہ بات ہمارے لیے یقیناً اچنبھے کا باعث بنی تھی۔ میں دھیرے سے بولا۔ "مگر شاہ صاحب! یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو زبردستی پاکستانی قرار دینا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے ضمن میں نہیں آتا؟" توسل شاہ نے میری جانب یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "جناب! آپ کون سے انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ بھارتی حکام کی نظر میں دنیا کا ہر مسلمان عموماً اور بھارتی مسلمان خصوصاً پاکستانی ہے۔ اس کا بس چلے تو سبھی بھارتی مسلمانوں پر پاکستانی کا لیبل لگا کر یا تو انہیں ختم کر دیں یا دیس سے نکال دیں۔"

کچھ توقف کے بعد توسل شاہ بولا۔ "آپ چاروں کے کال کوٹھڑی بھجوائے جانے کی خبر ہمیں مل گئی تھی جس پر ہم سبھی نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ اس کے نتیجے میں حکام نے آپ چاروں کو بیرک میں بھجوایا ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جلدی سے بولا۔ "یار میں نے شکریہ وصول کرنے کے لیے تمہیں یہ بات نہیں بتائی۔ بھلا اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ یہاں دشمن دیس میں بھی اگر ہم لوگ ایک دوسرے کی بھلائی نہیں سوچیں گے تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔ اپنے ملک میں رہتے ہوئے تو ہمیں ایک دوسرے کی ٹانگ

کھینچنے سے بھی فرصت نہیں ملتی۔ پھر آپ چاروں تو ہم سب کے لیے اس لئے بھی محترم ہیں کہ ہم سبھی اسمگلنگ یا دیگر ذاتی مفادات کے حصول کے لیے بھارت میں داخل ہوئے تھے جبکہ آپ چاروں قوم کے اجتماعی مفاد میں یہ مصائب جھیل رہے ہیں۔"

بات کچھ طول پکڑ گئی تھی' لہٰذا اللہ یار بھٹی اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولا۔ "شاہ جی! اس ذاتی اور اجتماعی مفاد میں جو بڑی معمولی سی حد فاصل ہوتی ہے اس پر کسی وقت بات کرلیں گے' فی الحال تو آپ ہمارے پیٹ کے مفاد کی بابت سوچیں۔"

نوجوان توسل شاہ خوشدلی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "واقعی آپ لوگوں کو بھوک لگی ہو گی۔" وہ وہیں بیٹھے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "ارے بھئی شیر محمد! جلدی کرو تم چائے پکا رہے ہو یا پائے؟"

چند روز وہاں رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ توسل شاہ کو وہاں موجود پاکستانی قیدیوں کے مسلمہ رہنما کی حیثیت حاصل ہے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ چند ہی روز بعد وہاں کی خوشگوار فضا میں ہم لوگ قید کی تلخیاں بڑی حد تک بھلا بیٹھے تھے۔ اپنوں کے درمیان جیل بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی پاکستانی نظر بند خاصی مراعات حاصل کر چکے تھے۔ اگرچہ یہ مراعات انہیں کسی نے پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کی تھیں بلکہ سبھی نے اپنے مثالی اتحاد و اتفاق اور توسل شاہ کی فعال قیادت میں یہ سب کچھ حاصل کیا تھا۔

وہاں جمع ہونے کے کچھ روز بعد ہی ٹریڈ یونین طرز کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ توسل شاہ کی تجویز پر آٹھ آدمیوں پر مشتمل مجلس عاملہ تشکیل دی گئی۔ ہر بیرک کا ایک نمائندہ عاملہ کا رکن تھا جبکہ توسل شاہ اور ظفر اقبال بالترتیب غیر اعلانیہ طور پر صدر اور نائب صدر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

شروع میں جیل حکام سے والی بال کھیلنے کی اجازت اور سامان حاصل کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر بیرک میں ایکسٹرا فائر لگا کر ریڈیو سننے کی اجازت بھی لے لی گئی۔ تمام پاکستانی

قیدیوں نے کسی قسم کی مشقت کرنے سے بھی انکار کر دیا جسے مجبوراً جیل حکام کو تسلیم کرنا پڑا کیونکہ آئے دن کی بھوک ہڑتالوں سے ان پر خاصا دباؤ پڑتا تھا۔

چند روز بعد پاکستانی مجلس عاملہ نے ہندوؤں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ بات حکام کو سخت ناگوار گزری تھی مگر کسی فوری ہنگامے سے بچنے کی خاطر یہ مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا اور خشک راشن فراہم ہونے لگا جسے خود پاکستانی پکاتے تھے۔ جیل کے لحاظ سے یہ سہولتیں مثالی تھیں۔ بھارتی حکام ان سب معاملات کو بڑی تشویش سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب اپنے اس فیصلے پر اکثر تاسف کا اظہار کرتے کہ تمام پاکستانیوں کو ایک جگہ کیوں جمع کیا گیا مگر فی الحال کسی مصلحت کی بنا پر خاموش تھے۔

اگلے اتوار کو دوپہر کے وقت والی بال گراؤنڈ میں دریاں اور کمبل بچھا کر ہم چاروں کے اعزاز میں "بڑے کھانے" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے میں ماش کی تڑکے والی دال اور آلو کی بھجیا شامل تھی۔ سوائے خواتین کے سب پاکستانی مرد اور بچے اس دعوت شیراز میں شامل ہوئے۔ کھانے کی لذت اپنوں کی چاہت کی بدولت دوبالا ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر ظہر کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔ اس کے بعد خوش گپیوں اور باہمی تعارف کا سلسلہ شروع گیا۔

ظفر اقبال نے سبھی کا تعارف کرایا جس میں پاکستان میں ان کی جائے رہائش اور بھارت میں پکڑے جانے کی مختصر روداد شامل تھی۔ یہ مرحلہ انتہائی دلچسپ تھا۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر کبھی ایک شخص کے پاس جاتا اور کبھی دوسرے کے۔ یہ ملک رمضان ہیں' منڈی بزمان کے رہنے والے۔ ان کے قبضے سے بوقت گرفتاری ۱۵ کلو چرس برآمد ہوئی تھی۔ یہ بٹ صاحب ہیں لاہور کے رہائشی' یہ دس کلو نگینے سمیت پکڑے گئے تھے اور یہ سلطان خان' آف پشاور ہیں جو پانچ من نگینے اور چار پستولوں سمیت پکڑے گئے تھے۔

الزام جتنا بڑا ہوتا مذکورہ شخص اتنا زیادہ سینہ پھلا کر بات کرتا۔ اس چکر میں خاصا وقت گزر گیا تو میں نے کہا۔ "یار ظفر صاحب! اب چلو چل کر بیٹھتے ہیں۔ تعارف کی اگلی

قسط پھر کبھی سہی۔" مگر ظفر اقبال میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "وہ درخت سے ٹیک لگائے جو صاحب آنکھیں موندے بیٹھے ہیں' وہ حاصل پور کے بشیر احمد ہیں۔ اچھے بھلے زمیندارہ کرتے تھے کہ دماغ میں حاجی مستان بننے کی ٹھان لی۔ اپنے سبھی مویشی بیچ کر چرس خریدی اور بھارت تشریف لے آئے تاکہ ایک ہی بار میں وارے نیارے ہو جائیں گے مگر پہلے ہی پھیرے میں دھر لیے گئے اور اب اکثر دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں کہ کبھی پہلا پھیرا لگانے بھارت کا رخ نہ کریں۔"

تعارف کا یہ سلسلہ اتنا دلچسپ اور پُرمغز تھا کہ وقتی طور پر ذہنی تناؤ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے ظفر بولا۔ "گرمی کے موسم میں کمبل اوڑھ کر لیٹے ہوئے حضرت رب نواز ہیں' نورت عباس کے سرحدی گاؤں کے رہنے والے۔ اچھا بھلا کھاتا پیتا ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے مگر منگنی نے اسے اس حال کو پہنچا دیا۔"

میں نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ "منگنی نے اس حال کو پہنچا دیا؟ میں سمجھا نہیں۔"

ظفر صاحب تفصیلات فراہم کرنے لگے۔ "رب نواز کی منگنی قریبی گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے طے تھی۔ ان کے علاقے کا المیہ یہ ہے کہ جس نوجوان نے ایک بار بھی بھارتی سرحد غیر قانونی طور پر عبور نہ کی ہو اسے اکثر لوگ بزدل خیال کرتے ہیں۔ رب نواز نے کبھی یہ غیر قانونی حرکت نہیں کی تھی کیونکہ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں تھا' لہٰذا اسے کبھی سمگلنگ یا چوری کے لیے بھارت جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔"

مجھے اب ظفر اقبال کی باتوں میں کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی' لہٰذا پورے انہماک سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ وہ اپنی جیب سے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔ "منگنی کے بعد رب نواز بہت ہی خوش تھا کیونکہ اس کے والدین نے اس کی پسند کے مطابق رشتہ طے کر دیا تھا' حالانکہ لڑکی قدرے غریب تھی مگر شکل و صورت کی کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ کچھ عرصہ بعد رب نواز کے جگری دوست رفیق نے اسے بتایا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ رب نواز کی منگیتر رانی اپنی سہیلیوں کے سامنے سخت شرمندہ رہتی ہے

کیونکہ اس کی بے تکلف سہیلیاں اسے اکثر طعنہ دیتی ہیں کہ اس کا منگیتر رب نواز تو بالکل نامرد ہے جس نے ایک بار بھی سرحد پار نہیں کی۔ اس بات پر کچھ روز تو رب نواز نے کان نہ دھرے مگر جب رفیق نے تواتر کے ساتھ اس بات کی تکرار شروع کر دی کہ سنا ہے رانی بہت پریشان رہتی ہے کہ مجھے ایسے کم ہمت کے پلے کیوں باندھا جا رہا ہے تو رب نواز کی مردانگی بھی تھوڑی جوش میں آئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے اوپر لگا بزدلی کا داغ مٹا کے رہے گا اور بھارت جا کر کسی اچھی نسل کا گھوڑا یا اونٹ خرید کر یا ہو سکا تو چرا کر لائے گا اور پھر اسی پر بیٹھ کر اپنی رانی کو بیاہنے جائے گا۔

"رفیق نے اپنی باتوں سے اس کے بلند عزائم کو مزید تقویت پہنچائی' لہٰذا شادی سے بیس روز قبل رب نواز نے تقریباً ایک من بادام کے مغز اٹھائے (واضح رہے کہ بادام سمگل ہو کر پاکستان سے بھارت جاتا تھا) اور رات کی تاریکی میں پاک بھارت سرحد عبور کر کے اپنے "مردانہ مشن" پر روانہ ہو گیا۔ رفیق نے سرحد تک ساتھ جا کر اسے نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا تھا اور اسے چند بھارتی اسمگلروں کے پتے بھی دیئے تھے تاکہ وہ ان کے ہاتھ بادام فروخت کر کے واپسی پر گھوڑا لا سکے۔ اگرچہ رب نواز کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ باداموں سے حاصل ہونے والی رقم کے عوض اپنی رانی کے لیے چند قیمتی جوڑے لائے گا تاکہ اس کی مکمل مردانگی کا سکہ ہمیشہ کے لیے رانی پر ثبت ہو جائے۔"

ظفر اقبال کہانی سناتے ہوئے چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ غالباً ہمارے چہروں سے اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ہم اس کی باتوں میں کس قدر دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اس داستان میں واقعی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ہلکے سے ظفر کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ "آگے بھی بتاؤ پھر کیا ہوا؟" ظفر دھیمی آواز میں بولا۔ "پھر کیا ہونا تھا' جیسے ہی رب نواز بادام لے کر رفیق کے بتائے ہوئے اسمگلر رتن لعل کے پاس پہنچا' اس نے بظاہر اس کی خاصی آؤ بھگت کی اور اندر بیٹھک میں بٹھا کر اسے کھانا وغیرہ دیا۔ اسی دوران اس نے پولیس بلوائی اور رب نواز کھانا کھاتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے اور اب

ڈھائی سال قید بامشقت کی سزا بھگت رہے ہیں اور سامنے کمبل اوڑھے لیٹے ہیں۔ "میر خوار کوئی پوچھتا نہیں........ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی" کی عملی تصویر بنے ہوئے ہیں۔"

ظفر کی بات سن کر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رب نواز کی حالتِ زار پر اظہار افسوس کروں یا اس کی حماقت پر..........

ظفر نے چند لمحوں تک ہم چاروں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد شگفتہ انداز میں کہا۔ "اس کے بعد پتہ ہے کیا ہوا؟"

میاں محمد خاں کچھ چڑ کر بولا۔ "یار! اب اس قصے کو ختم بھی کرو۔ اس کے بعد بھلا کیا ہونا تھا!"

ظفر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "جناب یہی تو آپ کو معلوم نہیں کہ اس کہانی کا کلائمکس کیا تھا۔"

ہم چاروں اس کی جانب کچھ کہے بغیر استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ وہ اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "رب نواز کی گرفتاری کے چند ماہ بعد ان کے قریبی گاؤں کا ایک شخص بھارت میں پکڑا گیا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ رب نواز کی گرفتاری کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد اس کے "جگری دوست" رفیق اور اس کی منگیتر رانی کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل ان دونوں نے اپنی ملی بھگت سے رب نواز کو بھارت جانے پر اکسایا تھا اور جب یہ واپس نہ آیا تو اسے بھارت جا کر اپنی مردانگی کا ثبوت فراہم کرنے والے مرد دانا نے اس کی عدم موجودگی میں خود اس کی منگیتر سے شادی رچالی اور اب رب نواز اکثر و بیشتر "نالے رن گئی نالے کن پاٹے" کا ورد کرتا رہتا ہے۔"

اس قصے نے یقیناً ہم سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تبھی مؤذن نے عصر کی اذان دی اور سبھی نے نماز ادا کی۔ شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور کچھ دیر بعد سب کو اپنی اپنی بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے اچانک آسمان بادلوں سے ڈھک

گیا۔ گرمی کی شدت سے لوگوں کا برا حال تھا۔ اگرچہ پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب گرمی بہت شدید نہیں پڑتی تھی مگر اس برس خلاف معمول نسبتاً زیادہ گرمی پڑی تھی۔ بادلوں کی آمد اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ہر شخص بڑی فرحت محسوس کر رہا تھا۔

بادل خاصی دیر گھن گرج کے جوہر دکھاتے رہے۔ ہر شخص بارش کی دعا کر رہا تھا مگر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا گرجنے والے برستے نہیں لہٰذا ہوا کچھ دیر بعد ان بادلوں کو اڑا لے جائے گی مگر کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ گرجنے والے کبھی کبھار برس بھی پڑتے ہیں اور جب برسنے لگیں تو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بارش نے چاروں طرف جل تھل کر دیا تھا۔ بیرک کے چاروں طرف دیواروں میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں جن سے آدمی تو باہر نہیں جا سکتا تھا مگر بارش کی تیز بوچھاڑ ضرور اندر آتی تھی اور آج بھی تین اطراف سے آ رہی تھی' لہٰذا سبھی لوگ چوتھے محفوظ کونے میں سمٹ گئے تھے۔ گرمی کے ان دنوں میں بھی اکثر لوگوں کو ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی' چنانچہ سبھی بارش رکنے کی دعائیں کر رہے تھے۔ ایسے میں بھلا نیند کسے آنا تھی' لہٰذا وقت گزاری کے لیے آپس میں بات چیت ہی واحد سہارا تھی۔

میں ظفر اقبال کی باتوں سے اب کسی قدر اکتا چکا تھا اور سلاخوں سے باہر برستی برسات کو دیکھنے میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد یونہی میں نے بیرک کے اندر لوگوں پر طائرانہ سی نظر ڈالی۔ آخری کونے والے بستر پر بیٹھا شخص بوچھاڑ میں بھیگتے ہوئے جانے باہر فضاؤں میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ میری نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ پینتیس چالیس برس کا پُروقار شخص تھا۔ مگر سب سے الگ تھلگ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرے قدم اس کی جانب اٹھ گئے۔ میں اس کے قریب پہنچ کر کچھ دیر کھڑا رہا۔ اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور سپاٹ انداز میں بولا۔ ''آؤ بیٹھ جاؤ۔'' میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا' مگر وہ مجھ سے بے نیاز دوبارہ بارش کے نظارے میں گم ہو گیا۔ میں نے بھی اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اگرچہ خود کو یوں نظرانداز کیے جانے پر مجھے

خاصی خفت محسوس ہو رہی تھی۔

اس دوران ظفر اقبال نے مجھے وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا' لہٰذا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ قریب آ کر وہ بھی چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ بیٹھے ہوئے شخص نے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھا اور دوبارہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

ظفر چند ثانیوں بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے میں وہی مخصوص شگفتگی تھی۔ ''ارے بھئی ابو جواد صاحب! کیا آپ کا تعارف ان سے ہوا؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور وہ فوراً رواں ہو گیا۔ ''یہ حضرت شادی شدہ ہیں۔''

میں نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ ''کیا مطلب؟ کیا یہاں موجود باقی پاکستانی سبھی کنوارے ہیں؟''

ظفر میری حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! ایسی بات تو نہیں مگر یہ ہمارے مراد صاحب دنیا کے پہلے اور غالباً آخری شوہر ہیں جنہیں اپنی بیوی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے اور عشق بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ..........''

مراد صاحب ڈانٹنے کے انداز میں بولے۔ ''ظفر! میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے مجھے یہ جگت بازی اچھی نہیں لگتی مگر تم ہر وقت اپنی بکواس جاری رکھتے ہو۔''

ظفر اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ ان کا اپنی شریکِ حیات سے عشق لیلیٰ مجنوں اور سسی پنوں والا ہے۔ بلکہ پنوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی سسی کو سوتے میں چھوڑ آئے ہیں اور اب ہر وقت اس کی یاد میں آہیں بھرتے رہتے ہیں۔''

اس دوران مراد نے تیکھی نظروں سے ظفر کو گھورا اور اس کا کان مروڑتے ہوئے سخت لہجے میں بولے۔ ''جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے سنجیدگی سے ان کے ساتھ بات کرنے دو۔''

ظفر وہاں سے فوراً اٹھ گیا تھا۔ مجھے ظفر اور مراد کے قلبی تعلق کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ مراد کے لہجے میں اس کے لیے پدرانہ شفقت موجود تھی۔

اس کے جانے کے بعد مراد مجھ سے بولا۔ "یار! معاف کرنا۔ تم خاصی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو اور میں اپنے آپ میں ہی گم رہا خیر' اپنے بارے میں بتاؤ کہ کب پکڑے گئے اور........"

میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرے بارے میں تو آپ یقیناً آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ کچھ اپنی سنایئے۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاصی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نفیس آدمی ہے لہٰذا آئندہ اس کے ساتھ گپ شپ جاری رہنی چاہیے۔

کچھ عرصے تک تو مراد کچھ لیے دیئے رہا اور محض رسمی باتوں سے آگے نہ بڑھا اس کا مجموعی رویہ عجیب سا تھا۔ زیادہ تر اپنے ہی آپ میں کھویا رہتا اس روز جیل میں خاصا ہنگامہ تھا۔ راکھی کا تہوار ہونے کی وجہ سے جیل سٹاف اور ہندو قیدی ہلے گلے میں مصروف تھے۔ اس خوشی کے موقع پر الور شہر کے اناتھ آشرم سے ایک ثقافتی طائفہ قیدیوں کو تفریح مہیا کرنے جیل میں آیا تھا۔ اس طائفے میں چند خواتین فنکارائیں بھی شامل تھیں جو اپنے ناچ گانے سے قیدی بھائیوں کے لیے منورنجن (تفریح) مہیا کر رہی تھیں اور قیدی بھائی ان پر دل و جان سے فدا ہو رہے تھے۔ ایسے میں مراد اور میں ایک درخت کے نیچے کمبل بچھائے دور سے اس ہنگامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مراد اس وقت بھی خیالوں میں گم تھا۔ میں نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "مراد بھائی! اس وقت تو راحت بھابی کی یادوں کے طلسم سے نکل آؤ۔ زمانے میں محبت کے علاوہ بھی تو بہت سے غم ہیں۔"

وہ چند لمحے انگلیوں سے زمین کریدنے کے بعد پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم صحیح کہتے ہو یار! مگر مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ مجھے تو ہر گھڑی راحت کا خیال رہتا ہے۔

اصل میں تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ راحت کس دلفریب شے کا نام ہے۔"

میں کچھ چڑ کر بولا۔ "تم کچھ بتاؤ گے تو پتہ چلے گا۔ ویسے کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" مراد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "نہیں یار! اگر خوبصورتی سے تمہاری مراد چہرے مہرے اور جسمانی بناوٹ سے ہے تو وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ ہزاروں یا لاکھوں میں ایک ہے۔ مگر اس کی سیرت کہیں زیادہ دلکش ہے۔ بہرحال اگر تم زیادہ بضد ہو تو میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر مراد پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ چند لمحے اس کی یہی کیفیت رہی پھر آہستگی سے بولا۔ "میرے والد محکمہ انہار میں ایس ڈی او تھے جب میں پیدا ہوا۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ لہٰذا سبھی والدین کی طرح بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ میں پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ میری والدہ فوت ہو گئیں۔ چند سال والد صاحب نے شادی نہیں کی اور مجھ پر بھرپور توجہ دیتے رہے' مگر پھر عزیز و اقارب کے اصرار پر شادی کر لی۔

"وہیں سے میری بدبختی کا دور شروع ہوا۔ میری نئی ماں روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ میرے تین سوتیلے بھائی پیدا ہوئے تو آہستہ آہستہ والد کی توجہ مجھ پر سے مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ میں ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے نئی نئی بدتمیزیاں سیکھتا چلا گیا لیکن یہ ساری باتیں میرے حق میں اور بھی بری ثابت ہوئیں اور ایف اے کرنے تک میرا شمار برادری اور محلے میں انتہائی ناخلف اولاد کے طور پر ہونے لگا۔

"میں اگرچہ فطری طور پر پڑھائی میں خاصا ذہین تھا مگر بری صحبت کے سبب دھیرے دھیرے واجبی سا طالب علم بن کر رہ گیا۔ گھر سے چھوٹی موٹی چوریاں کرنا میرا معمول بن گیا جس کی وجہ سے والد کے دل میں بھی میرے لیے کوئی نرم گوشہ نہ رہا۔ انہوں نے مجھے جائیداد سے مکمل طور پر عاق کر دیا۔

"میں پنجاب چھوڑ کر حیدر آباد چلا گیا۔ وہاں میں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں۔

تنخواہ وغیرہ جو کچھ ملتا' اپنے نشے پر ضائع کر دیتا۔ اس دوران کئی بار دھمکی وغیرہ کے ذریعے والد سے بھی کچھ رقم لے آتا مگر جس راہ پر میں چل رہا تھا اس پر تو دولت کے کنویں بھی بھرے ہوئے ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں' لہٰذا روز بروز میری حالت بگڑتی چلی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے حیدر آباد کے نواح میں واقع ایک چھوٹی سی نرسری پر ملازمت کر لی۔ یہاں میں پودوں کی دیکھ بھال کرتا اور مالک کی غیر موجودگی میں حساب کتاب بھی میرے پاس ہوتا۔

"نرسری کا مالک عبدالکریم قیام پاکستان کے وقت بھارت کے علاقے بلند شہر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ فسادات کے دوران اس کا سارا کنبہ مارا گیا تھا۔ اس نے حیدر آباد میں آکر مختلف شعبوں میں قسمت آزمائی کے بعد نرسری بنا لی۔ وہیں کچھ عرصہ بعد اس نے کسی بے سہارا عورت سے شادی کر لی۔ ان کے ہاں ایک ہی لڑکی پیدا ہوئی اور عبدالکریم کی بیوی بھی طویل عرصہ بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئی۔ کریم نے اپنی بیٹی کو بے پناہ پیار دیا اور اسی کے لیے زندگی وقف کر دی۔ میں انہی کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی لڑکی راحت اپنے نام کی مناسبت سے واقعی مثالی لڑکی تھی۔

"میرے جیسا حیوان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ نرسری کے اندر ہی چھوٹے سے کوارٹر نما مکان میں باپ بیٹی کی رہائش تھی' لہٰذا میرا آنا جانا بھی اکثر رہتا۔ میں اس دوران بھنگ' چرس کا رسیا ہو چکا تھا۔ راحت اور اس کے باپ کو میری حرکتوں کا اندازہ تھا۔ اس کے باوجود جانے کیوں مجھ پر بھروسہ کرتے تھے۔

"ایک روز راحت نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نشہ وغیرہ اور برے دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دوں تو ہو سکتا ہے اس کے والد اس کے ساتھ میری شادی پر رضا مند ہو جائیں۔ یہ ۱۹۷۲ء کے اوائل کی بات تھی۔ میں ذلت کی جن گہرائیوں میں گر چکا تھا' وہاں سے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شریف آدمی اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے سونپ سکتا ہے۔

"راحت کی زبان میں جانے کیا تاثیر تھی کہ میں نے سیدھی راہ اپنانے کا فیصلہ کر

لیا' حالانکہ اس سے قبل بھی کئی بار اپنے طور پر برائیوں سے باز رہنے کا عہد کر چکا تھا مگر کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب مجھے حیرانی تھی کہ کس طرح چند ماہ میں ایک نیا انسان بن گیا تھا۔ جون ۱۹۷۲ء میں میری شادی انتہائی سادگی سے ہو گئی۔ ہماری شادی میں میری جانب سے میرا دوست ظفر اقبال ہی تھا جبکہ ان کے بھی چند پڑوسیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"شادی کے بعد مجھے احساس ہوا کہ راحت میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جن کی ہمارا مذہب اور معاشرہ کسی بھی عورت سے توقع رکھتا ہے۔ میری زندگی میں ایسا خوشگوار انقلاب برپا ہوا کہ گزرے ہوئے تمام مصائب قصے کہانیوں کی باتیں محسوس ہونے لگے۔ ۱۹۷۳ء کے مارچ میں میرے گھر خدا نے بیٹی دی۔

"میرے سسر بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کے علاج پر بھی خاصا خرچ اٹھنے لگا۔ نرسری بھی اوقاف کی زمین پر تھی۔ انہوں نے بھی نوٹس بھجوا دیا کہ چھ ماہ کے اندر یہ زمین خالی کر دی جائے۔ میں اس صورتِ حال کی بدولت اکثر پریشان رہنے لگا لیکن راحت مجھے ہمیشہ تسلی دیتی کہ کیا ہوا اگر ہمیں نرسری اور کوارٹر خالی کرنا پڑے گا تو کہیں بھی کرائے پر رہ لیں گے اور دونوں مل جل کر محنت کر کے گھر کا خرچ پورا کریں گے۔

"مگر اس مرحلے پر دوبارہ میرے دماغ نے پلٹا کھایا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو کسی مشکل صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دوستوں کی زبانی مجھے علم تھا کہ اسمگلنگ کافی منافع بخش دھندا ہے۔ میرا باپ اب ایکسین ہو چکا تھا۔ میں ایک بار اس کے پاس بھی گیا تھا مگر اس نے ذلیل کر کے مجھے گھر سے نکال دیا۔ محکمہ اوقاف کے دیئے ہوئے چھ ماہ کے نوٹس کی میعاد بھی کم ہو رہی تھی' لہٰذا میں جلد سے جلد کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ظفر اقبال کو بھی پٹی پڑھائی کہ اپنی بس کنڈکٹری کی نوکری پر لعنت بھیجے اور میرے ساتھ مل کر اسمگلنگ سے تھوڑے عرصے میں لاکھوں کروڑوں کما لے۔

"یہ بے چارا بھی میرے کہنے میں آ گیا اور ہم دونوں نے کسی طرح دس کلو چرس

خریدی اور سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو گئے جہاں بھارتی سیکیورٹی فورس نے ناکا لگا رکھا تھا' لہٰذا ہم دھر لیے گئے۔ ہم جون ۱۹۷۳ء میں ہندومل کوٹ کے بارڈر پر گرفتار ہوئے تھے اور ہمیں گنگا نگر میں دو دو سال قید کی سزا ہوئی تھی جو ہم گزشتہ سال بھگت چکے ہیں مگر باقی لوگوں کی طرح ابھی تک نظر بند ہیں۔"

میں خاموشی سے مراد کی داستان سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔
"تم نے اپنی گرفتاری کی خبر اپنے گھر میں دی یا نہیں؟"

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "اصل دکھ کی یہی تو بات ہے۔ پہلے ڈیڑھ سال تک تو پاکستان اور بھارت کے سفارتی تعلقات نہ ہونے کے سبب ڈاک کا رابطہ ہی نہ تھا۔ جب اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ڈاک کا نظام بحال ہوا تو میں نے کئی خط لکھے مگر کسی کا جواب نہیں آیا۔ میں نے آتے وقت راحت کو یہی بتایا تھا کہ میں ہفتے کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اس بے چاری کو کچھ علم نہ تھا۔

"اب گزشتہ پونے دو سال میں درجنوں خط لکھ چکا ہوں' مگر کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ ظفر اقبال کی والدہ اور بہنوں کو بھی کئی خط لکھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ حیدر آباد اس پتہ پر گئے تھے مگر وہاں اب کسی نرسری کا وجود نہیں۔ وہ ساری زمین اوقاف کی تھی جو خالی کرا لی گئی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ میں نے ایک بے سہارا معصوم لڑکی کی حفاظت کا ذمہ ساری عمر کے لیے لیا تھا مگر انسانی درندوں کے اس جنگل میں اسے تنہا چھوڑ کر خود جیل کی مضبوط دیواروں کے پیچھے آ چھپا ہوں اور مجھے اپنی بچی یا بیوی کی بابت کچھ بھی علم نہیں کہ وہ معصوم جانیں اب کس کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ زندہ بھی ہیں تو کس حال میں!"

یہ کہتے ہوئے مراد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے تھے۔ خود میں بھی آبدیدہ سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"حوصلے سے کام لو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ کسی بات کی تلقین کرنے اور اس پر عمل

کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے' مگر فی الحال ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔"

ماحول بڑا بوجھل سا ہو گیا تھا۔ دور سے ظفر اقبال آتا دکھائی دیا۔ قریب آ کر وہ خلافِ معمول سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مراد بھائی! لگتا ہے آج پھر وہی موضوع زیرِ گفتگو رہا ہے خدا کے بندے! حوصلہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆======☆======☆

جیل میں رہتے ہمیں خاصے دن ہو گئے تھے۔ جیل کا عملہ کافی دب کر رہتا تھا کیونکہ انہیں علم تھا کہ یہ لوگ چھوٹی سی بات کو لے کر اجتماعی ہڑتال پر اتر آتے ہیں۔ جیل میں یہ حربہ خاصا کارگر بھی ثابت ہوتا ہے' خصوصاً بھارتی جیلوں میں کیونکہ بھارتی قوم کے "باپو" مہاتما گاندھی کی تو ساری سیاست ہی "مرن برت" کے گرد گھومتے گزری تھی' لہٰذا وہاں اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔

اس تمام صورتِ حال کا ایک منفی نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ چند پاکستانی قیدی بعض اوقات حد سے بھی گزر جاتے اور اکثر ہندو عملے سے تو تکار کی نوبت آتی رہتی۔ بہرحال مجموعی صورتِ حال قابو میں ہی رہتی۔ جولائی ۱۹۷۶ء کے آخر میں سبھی پاکستانیوں نے اجتماعی ہڑتال کر دی۔ مطالبہ یہ تھا کہ جو پاکستانی سزائیں کاٹ چکے ہیں اور کسی دیگر مقدمے میں مطلوب بھی نہیں انہیں فوراً رہا کر کے پاکستان بھیجا جائے۔

پہلے دو تین روز تو الور کا ضلع کلکٹر رام پال مذاکرات کے لیے آیا لیکن بات آگے نہ بڑھی۔ ہڑتال میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ہڑتال کے پانچویں روز راجستھان کا آئی جی جیل خانہ جات رادھا کانت شرما اور ہوم سیکرٹری لعل چند آئے۔ طویل مذاکرات کے بعد انہوں نے یہ پیشکش کی کہ ہڑتال ختم کرنے کی صورت میں نظر بند پاکستانیوں کو ہر ہفتے پچاس پچاس کی ٹولیوں کی صورت میں پاکستان پہنچا دیا جائے گا مگر ہڑتالی قائدین کا اصرار تھا کہ جب تک انہیں لینے کے لیے بسیں جیل کی ڈیوڑھی پر نہیں آتیں' ہڑتال جاری رہے گی' سو مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

ہڑتال کے ساتویں روز ہم میں سے اکثریت کی حالت بگڑنے لگی تھی' لہٰذا جس کی حالت زیادہ تشویش ناک ہوتی اسے فوراً سول ہسپتال لے جایا جاتا جہاں ناک کے راستے اسے زبردستی فیڈ کیا جاتا اور وہیں سے اسے کسی دوسری جیل بھجوا دیا جاتا۔ اس طرح دو روز میں تقریباً پچاس افراد کو بیکانیر' بھرت پور' اور جے پور کی جیلوں میں بھجوا دیا گیا۔ نویں روز جب یہ بات پھیلی کہ توسل شاہ سمیت پچاس آدمی دوسری جیلوں میں بھیجے جا چکے ہیں اور وہاں انہوں نے ہڑتال ختم کر دی ہے تو ہم میں سے اکثر افراد حوصلہ ہار بیٹھے اور کوئی ٹھوس مطالبہ منوائے بغیر ہڑتال بری طرح ناکام ہو گئی۔

اس کے بعد جیل حکام کا رویہ خاصا درشت ہو گیا تھا۔ غالباً اوپر کی سطح پر پاکستانیوں کو آہنی ہاتھ سے دبانے کی پالیسی طے کر لی گئی تھی۔ اس دوران الور کے جیل سپرنٹنڈنٹ رائے سنگھ کو تبدیل کر دیا گیا اور نئے سپرنٹنڈنٹ دیوی پرشاد ترپاٹھی نے چارج سنبھال لیا۔

اگست کے آخری ہفتے میں رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہو گیا۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو رمضان کی سات اور جمعے کا دن تھا۔ دوپہر کے وقت یونس مسیح نامی پاکستانی روز کی طرح جیل ڈیوڑھی میں پاکستانیوں کی ڈاک وصول کرنے پہنچا تو وہاں موجود حوالدار اور دونوں سپاہیوں نے اسے بلاوجہ بری طرح مارا پیٹا۔

یونس نے واپس پاکستانی وارڈ میں آکر ہم لوگوں کو اس واقعے سے آگاہ کیا تو سب اشتعال میں آگئے۔ فوراً ہی اکٹھے ہوئے اور آئندہ کی حکمت عملی طے کی جانے لگی۔ اس موقع پر چند لوگوں نے بڑی جذباتی تقریریں کیں' خصوصاً ضلع میانوالی کے رانا لیاقت نے زورِ خطابت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور کہا۔ "اسلام میں جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ کی سزا کا حکم ہے' لہٰذا جیل حکام سے مطالبہ کیا جائے کہ مذکورہ حوالدار اور دونوں سپاہیوں کو ہمارے حوالے کیا جائے' تاکہ ہم خود انہیں اپنے ہم وطن یونس کو بلاوجہ پیٹنے کی سزا دے سکیں۔"

اس مطالبے پر چشم زدن میں اتفاق رائے ہو گیا۔ چند لوگ اس مطالبے کو انتہا پسندانہ قرار دے رہے تھے۔ اس حوالے سے ہارون آباد کے احمد دین نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دوستو! جیسا کہ آپ میں سے اکثر حضرات جانتے ہیں کہ میں اپنی عمر کے بیس سال سے زیادہ پاکستان' بھارت اور ایران کی مختلف جیلوں میں مختلف الزامات کے تحت گزار چکا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ جیل حکام ہمیں پوری طرح دبانے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں ہیں' لہٰذا کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں' حالانکہ انہوں نے ابھی تک اڑتی ہوئی دیکھی ہے' پھنستی ہوئی نہیں دیکھی (اس نے یہ الفاظ پنجابی میں کہے تھے........... "اڈیاں ویکھیاں نیں تے پھسدیاں نئیں ویکھیاں" .... اڈیاں' پھسدیاں سے مراد فاختائیں ہیں اور مفہوم اس کہاوت کا یہ ہے کہ تم نے آرام اور سہولت کے دن دیکھے ہیں' مشکل حالات نہیں دیکھے۔)

چند اور افراد کے علاوہ میں بھی اسی رائے کا حامی تھا کہ جوش میں ہوش کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے مگر ہماری دلیلوں کو بہاولنگر سے تعلق رکھنے والے کسرتی جسم کے مالک یوسف ارائیں نے یکسر مسترد کرتے ہوئے یہ پھبتی کسی۔ "بھائیو! ہم میں سے کچھ لوگ آپ کو بزدلی کا درس دے رہے ہیں۔ اب میں اپنا دل نکال کر کس کس کے سینے میں ڈالوں۔"

اس کے جوشِ خطابت نے مجمع کو پوری طرح سنجیدہ کر دیا تھا اور ہمیں سبھی لوگ ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت وہی حوالدار اور دونوں سپاہی سینہ تانے پاکستانی وارڈ میں داخل ہوئے۔ پھر کیا تھا درجنوں پاکستانی قیدی دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ کا نعرہ لگاتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے وہ ساری ٹھکائی انہیں لوٹا رہے تھے جو انہوں نے یونس مسیح کی بلاوجہ کی تھی۔

ہندو حکام نے یقیناً یہ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا تھا۔ فوراً ہی جیل کی

فضا خطرے کے الارم کی بے ہنگم آواز سے گونجنے لگی۔ سپرنٹنڈنٹ نے پہلے ہی سے پولیس کی بھاری نفری منگوا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جیل پولیس کا عملہ اور ۵۰۰ ہندو قیدیوں کو بھی کھول دیا گیا۔ یہ واقعہ شام کے سوا چھ بجے پیش آیا تھا۔

ایک ہزار سے زیادہ مسلح پولیس اور پانچ سو ہندو قیدی لاٹھیاں لے کر پاکستانی قیدیوں پر پل پڑے تھے۔ ہر پاکستانی کو فرداً فرداً وحشیانہ طریقے سے مارا گیا۔ باقی بیرکوں میں بری طرح مار پیٹ کرنے کے بعد ۱۵ نمبر بیرک کا نمبر آیا۔ یہ بیرک ہندو حکام کی نظر میں عرصے سے کھٹک رہی تھی کیونکہ انہیں علم تھا کہ پاکستانی قیدیوں کے تمام چھوٹے بڑے سرکردہ افراد اسی بیرک میں ہیں‘ لہٰذا یہ مدت سے ہٹ لسٹ میں سرفہرست تھی۔

سپرنٹنڈنٹ دیوی پرشاد ترپاٹھی بہ نفس نفیس بیرک کے باہر کھڑا بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”شاباش بھارت کے ماتا کے سپوتو! آج جتنے چاہے لوگ جان سے مار ڈالو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ آج اس کھیل میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ہندو کو چھ ماہ کی اضافی معافی ملے گی۔“ اور ہندو سپاہی اور قیدی ”جے شیو شنکر“ اور ”بھارت ماتا کی جے“ کے نعرے لگاتے ہوئے نہتے پاکستانیوں پر اپنی بہادری کا سکہ جما رہے تھے۔

دس پندرہ کی ٹولیوں میں ہندو ۱۵ نمبر بیرک کے ایک کونے سے شروع ہوتے اور ہم میں سے ہر شخص کو مارتے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ پہلا گروپ دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا اور اس کی جگہ تازہ جتھا مشق ستم میں مصروف ہو جاتا۔ چاروں طرف آہ و بکا جاری تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مگر سپرنٹنڈنٹ ترپاٹھی کی زیر نگرانی یہ وحشیانہ عمل ابھی جاری تھا۔ اب تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہم میں سے اکثر افراد چیخنے چلانے کے بھی قابل نہیں رہے تھے اور بے سدھ پڑے اپنی بے بسی کا ماتم کر رہے تھے۔

رات ڈھلنے کے سبب ہوا میں خاصی خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا اور اس سے ماحول عجیب وحشت ناک ہو چکا تھا اور ہماری بیرک کسی مقتل گاہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس وقت جیل کا ڈاکٹر نیل کنٹھ آگے بڑھا۔ شاید اس میں انسانیت

کی کوئی رمق موجود تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بولا۔ ”مسٹر سپرنٹنڈنٹ! یہ سراسر ظلم ہے۔ یہ انیائے (ظلم) ہے‘ میں ان حالات میں کسی قیدی کا علاج نہیں کروں گا۔“

سپرنٹنڈنٹ ترپاٹھی شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا اور ڈاکٹر کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے غرایا۔ ”جاؤ جا کر ڈسپنسری میں بیٹھو۔ الور میں ڈاکٹروں کی کوئی کمی نہیں۔ مجھے اگر ضرورت پڑی تو میں ان کو بلا لوں گا۔“

یہ وحشیانہ کھیل تب اختتام کو پہنچا جب ہندو قیدی اور سپاہی مار مار کر خود تھک گئے۔ بیرک میں ہر طرف لہو پھیلا ہوا تھا بیرک کی دیواریں‘ فرش‘ دریاں‘ کمبل ہر چیز لہو رنگ ہو چکی تھی۔ بیرک میں موجود تیس افراد کے بے حس و حرکت اجسام لہو میں لتھڑے جا بجا فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ تبھی ترپاٹھی کے حکم پر چیف ہیڈ وارڈن آگے بڑھا اور جھک کر باری باری ہم سب کو دیکھنے لگا۔ ہر چہرے پر اتنا خون جما تھا کہ اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔

ہم تمام افراد کے بازو ٹانگیں کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھیں۔ خود میرا بھی بایاں بازو اور بائیں ٹانگ پنڈلی سے ٹوٹ چکی تھی اور سر پچھلی جانب سے پھٹ گیا تھا۔ جہاں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔

اسی حالت میں ہم سب کو ہندو قیدیوں اور سپاہیوں نے اٹھا کر جیل ڈیوڑھی میں پہنچایا جہاں پہلے سے پولیس کے بڑے ٹرک ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان سب کے عقبی دروازے کھلے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو قیدی نمبردار پاؤں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے اور ایک جھولا سا دے کر وہیں کھڑے ہمیں ٹرک کے اندر پھینک دیتے۔ جیسے ہم انسان نہیں بلکہ اناج وغیرہ کے تھیلے ہوں۔ ٹرک کے فرش پر گرتے ہی ہر شخص کے حلق سے طویل چیخ نکلتی مگر وہاں کسے پروا تھی۔ صبح کے تین بجے ہمیں قریبی اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ہماری ٹانگوں اور بازوؤں پر الٹا سیدھا پلستر چڑھا دیا گیا اور سر کی جلد کو سن کیے بغیر ٹانکے لگا دیے گئے جیسے کسی غیر اہم کپڑے کو سیا جاتا ہے۔

دو گھنٹے بعد صبح پانچ بجے ہمیں جیل واپس لایا گیا۔ مرکزی دروازے کے باہر موجود چھوٹی سی زنانہ جیل میں ہمیں رکھا گیا اور پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں لگا دی گئیں۔ تب تک ہم سب کی حالت اتنی غیر تھی کہ اپنے سوا کسی کا کچھ ہوش نہ تھا۔ زنان خانے میں میرے ساتھ ہی فرش پر مراد بھی بے سدھ پڑا تھا۔ تبھی سپرنٹنڈنٹ ترپاٹھی دو جیلروں اور آٹھ دس تمبرداروں کی معیت میں اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں ہمیں گھورتے ہوئے سب کے پاس سے گزرا اور پھر دروازے میں کھڑا ہو کر جیلر سے بلند آواز میں مخاطب ہوا۔ ''بنسی لعل! مرنے والوں کے نام کیا کیا ہیں' انہیں بھی بتا دو' شاید ان میں سے کسی کا عزیز بھی ہو۔'' یہ سنتے ہی ایک لمحے کے لیے ہم سب گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔

جیلر بنسی لعل اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ '' سر! ابھی تک تو صرف تین ہی مرے ہیں۔ محمد سرور' فتح محمد اور ظفر اقبال۔ ویسے آشا (امید) ہے کہ ان میں سے بھی ایک آدھ پرلوک سدھار جائے گا۔''

ایک لمحے کے لیے ہم میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں آیا تھا' البتہ سبھی نے بیرک کے طول و عرض میں غالباً ان تینوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی' مگر واقعی ان میں سے کوئی بھی ہمارے درمیان موجود نہ تھا۔ ہم سبھی اپنی تکلیف بھول کر جیلر ترپاٹھی کی جانب متوجہ تھے۔ دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ شاید ہماری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری نگاہیں جن کو اردگرد ڈھونڈ رہی ہیں' وہ تو نرک (جہنم) میں بھی پہنچ چکے۔ انہیں تو اس دنیا سے گئے بارہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

مراد کراہتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر سپرنٹنڈنٹ! مجھے یقین ہے تم جھوٹ بول رہے۔ تم صرف ہمیں ڈرانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو۔''

ترپاٹھی نے اپنی لمبی سی چٹیا کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''ارے میاں! تم جان بوجھ کر

آنکھیں بند رکھنا چاہو تو نہ مانو۔ ویسے وہ تینوں واقعی مر چکے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ایک لحاظ سے یہ ان کے لیے اچھا ہی ہوا۔ اگر ہماری قید سے رہائی نہیں پا سکے تو جیون کی قید سے تو رہائی پا گئے۔ تم لوگوں سے تو وہی غیرت والے نکلے۔ اس سنسار میں جتنا زندہ رہتے اتنے ہی مزید پاپ اپنے کھاتے میں جمع کرتے۔''

ترپاٹھی اپنی یاوہ گوئی میں مصروف تھا۔ مراد اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہلکے سے بڑبڑایا۔ ''ترپاٹھی! اگر واقعی ظفر اقبال مر گیا ہے تو سمجھ لو تم بھی مر گئے۔ اس وقت شاید تمہیں یہ بات محض دھمکی محسوس ہو۔ مگر......... ترپاٹھی! میری بات سنو اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو مجھے ابھی مار ڈالو ورنہ ....'' یہ کہتے ہوئے وہ تکلیف اور تھکن سے ہانپتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

اس کی بات سن کر ترپاٹھی کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں۔ آگے بڑھ کر اس نے اپنا پاؤں مراد کے چہرے پر رکھ دیا۔ پھر اپنے جوتے کی نوک سے اس کی ناک دباتے ہوئے بولا۔ ''چیونٹی کی اولاد! میں چاہوں تو ابھی تم کو مسل سکتا ہوں۔ میری ملازمت تیس برس ہو چکی ہے اور سروس کے دوران بڑے بڑے تیس مار خان ڈکیتوں اور خونیوں سے پالا پڑا ہے۔ اگر میں ایسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا ہوتا تو کب کا گھر جا بیٹھتا۔ ویسے تمہیں ابھی ماروں گا نہیں۔ دیکھتا ہوں تم میں کتنا دم خم ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے مراد کے چہرے سے پاؤں ہٹا لیا اور جیلر سے کہنے لگا۔ ''تینوں مرنے والوں کو سرکاری خرچ پر دفنا دو۔ کیا یاد رکھیں گے کسی مرد سے پالا پڑا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ زنان خانے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ماتحت بھی اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

اس روز یعنی ۴ ستمبر ۱۹۷۶ء کو سہ پہر تک ان تینوں کی موت کی تصدیق کئی اور سنتریوں کی زبانی بھی ہو گئی تھی۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ دوپہر کو انہیں الور کے نواح میں ایک ویران قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ ہم میں سے ہر شخص بری طرح دل گرفتہ تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے ان تینوں کے چہرے آ رہے تھے جو گزشتہ شام تک ہمارا حصہ تھے مگر

آج ان کی بے گور و کفن لاشیں بے نام قبروں میں دبا دی گئی تھیں۔ موت تو ہر شخص کو آنی ہے مگر وطن سے دور ایسی بے کسی کی موت پر جہاں آنسو بہانے والی ایک بھی آنکھ نہ تھی، فاتحہ پڑھنے کے لیے دو ہاتھ بھی نہ اٹھے اور وہ تینوں منوں مٹی تلے ہمیشہ کی نیند جا سوئے.........ہم اشکبار تھے۔

ہم سبھی اپنی تکلیف قطعاً بھول چکے تھے۔ رہ رہ کر وہی خیال ذہن پر چھا جاتا، خصوصاً میری آنکھوں کے سامنے ظفر کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا جو کسی پل بھی سنجیدہ نہ ہوتا۔ مراد کی آنکھیں تو جیسے پتھرا گئی تھیں۔ میں گھسٹ کر اس کے قریب ہوا اور بولا۔ "مراد بھائی! موت نے تو سبھی کو جلد یا بدیر آلینا ہے مگر یقین مانو مجھے ظفر کی اس بے وقت موت کا بے انتہا صدمہ ہے۔"

مراد جواب میں خاموشی سے مجھے تکتا رہا پھر تلخ لہجے میں بولا۔ "ہاں اس کی موت بہت بڑا سانحہ ہے بلکہ باقی دونوں کی موت بھی اتنی ہی تکلیف دہ ہے۔ مگر شاید کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ خدا ہر شخص کو تبھی اپنے پاس بلاتا ہے جب وہ اس دنیائے فانی میں اپنا وقت پورا کر چکا ہوتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ تو پیچھے زندہ رہ جانے والوں کا ہے جو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ سرور اور فتح محمد کے گھریلو حالات کا تو مجھے علم نہیں مگر ظفر کا باپ پہلے ہی مر چکا ہے۔ چار جوان بہنیں اور بوڑھی ماں اسی کی آس پر زندہ تھیں۔ میں تو یہ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ ان کا سامنا کس طرح کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مراد کو دیگر چھ آدمیوں کے ساتھ اودھے پور جیل روانہ کر دیا گیا جبکہ اس کے دو روز بعد مجھے پانچ دوسرے افراد کے ساتھ جودھپور بھجوا دیا گیا۔ پھر چند ماہ بعد ہم ۲۷ آدمیوں کے خلاف تہرے قتل کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ بھارتی حکام نے استغاثے میں کہا تھا کہ ہم ستائیس پاکستانیوں نے الور جیل سے فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر عین وقت پر سرور، فتح محمد اور ظفر اقبال نے ہمیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے

باقیوں نے طیش میں آکر ان تینوں کو قتل کر دیا۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے دعویدار برہمن حکمرانوں سے ہمیں اس سے کم کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔ استغاثے نے بچپن گواہ بھی بنا لیے تھے جنہوں نے عدالت میں آکر بھگوان کی سوگند کھا کر بیان دیا کہ تینوں افراد کے قاتل یہی ستائیس پاکستانی ہیں۔ یہ مقدمہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج الور کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ہم سب ہر پیشی پر مختلف جیلوں سے الور آتے اور پیشی بھگت کر واپس اپنی جیلوں میں چلے جاتے۔ وہیں مراد سے بھی پیشی کے روز مختصر سی ملاقات ہوتی۔

یہ مقدمہ ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ تک زیر سماعت رہا۔ بظاہر محسوس ہو رہا تھا کہ ہم میں سے اکثر کو اس ناکردہ جرم میں پھانسی یا عمر قید کی سزا ہو جائے گی کیونکہ سبھی گواہ دھڑلے سے ہمیں قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر پھر اچانک حالات نے ہمارے حق میں پلٹا کھایا۔

اندرا گاندھی نے جون ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک پوری بھارتی اپوزیشن کو ایمرجنسی نافذ کر کے جیلوں میں بند کر رکھا تھا۔ جب ستمبر ۱۹۷۶ء میں الور میں یہ سانحہ رونما ہوا تو بھارتی اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر خود جیلوں میں تھے، لہٰذا وہ جانتے تھے کہ یہ تینوں قتل حقیقت میں بھارتی سرکار نے کیے ہیں اور ان پاکستانیوں پر ناحق الزام دھر دیا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اندرا گاندھی کو مرکزی صوبائی انتخابات میں کامل شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مرار جی ڈیسائی کی قیادت میں جنتا حکومت بن گئی۔

• راجستھان میں بھی بھیروں سنگھ شیخاوت وزیر اعلیٰ بنے۔ وہ خود بھی اور ان کے وزیر داخلہ پروفیسر کیدار ناتھ شرما اس پورے واقعے کی اصلیت سے واقف تھے، لہٰذا انہوں نے اپنی انسانیت کا ثبوت ضرور دیا کہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں یہ مقدمہ واپس لے لیا ورنہ اس مقدمے میں ہم لوگوں کو یقیناً لمبی سزا ہوتی۔ مقدمہ واپس ہونے کے بعد مراد سمیت سبھی لوگ پاکستان بھجوا دیے گئے کیونکہ وہ کسی اور مقدمے میں مطلوب تھے اور نہ کسی جرم

میں سزا کاٹ رہے تھے۔ مجھے چونکہ پاکستان کے لیے جاسوسی کے الزام میں طویل سزا سنائی جا چکی تھی' اس لیے میں ۱۹۸۲ء کے آخر میں باہمی تبادلے کے ذریعے پاکستان آیا۔

☆======☆======☆

مراد جنوری ۱۹۷۹ء میں دیگر پچیس پاکستانی نظربندوں کے ساتھ واہگے کے راستے پاکستان پہنچا تھا۔ پاکستانی حکام نے ضروری پوچھ تاچھ کے لیے چند روز ان سب کو اپنی تحویل میں رکھا اور پھر انہیں رہا کر دیا گیا۔

حیدر آباد اس کے گھر تک جانے کا کرایہ بھی حکام ہی نے فراہم کیا تھا۔ موسم سرما اپنے شباب پر تھا۔ کراچی ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن سے دھیرے دھیرے کھسکنے لگی تو مراد گاڑی کے شیشوں سے تقریباً چپکتے ہوئے باہر جھانکنے لگا۔ کئی سال بعد وہ آزادی کی حالت میں سفر کر رہا تھا' لہٰذا اس کی حالت اس بچے جیسی ہو رہی تھی جو زندگی میں پہلی بار گاڑی میں بیٹھا اور تجسس بھری نگاہوں سے ہر چیز کو بغور دیکھ رہا ہو۔

بسنت کی آمد آمد تھی۔ اس لیے لاہور کے شہری پتنگ بازی کے ذریعے اپنی زندہ دلی کا ثبوت دینے پر تلے ہوئے تھے۔ فضا میں چاروں طرف اڑتی پتنگیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ مراد کو اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو ریل گاڑی کے ڈرائیور کو لاہور کے بعد سیدھا حیدر آباد جا رکنے کا حکم جاری کر دیتا۔ کھڑکی کا شیشہ غالباً کہیں سے تھوڑا ٹوٹا ہوا تھا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے تسلسل کے ساتھ اس کے خیالات کو منتشر کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے نے ہر چیز کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا' اس لیے مراد نے گاڑی کے باہر دیکھنا چھوڑا اور ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ گزرے ہوئے لمحات کا ایک ایک پل اسے اپنے سامنے محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن پر راحت کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی تصویریں فلم کی طرح گھومتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد اس نے مراد جیسے اکھڑ مزاج شخص کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ

بس اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ دھان پان سی لڑکی اپنے کردار میں وفا شعاری کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ اس کی خوش اخلاقی' پاک دامنی اور وفا کشی نے چند ہی مہینوں میں شوہر کو آدمی سے انسان بنا دیا تھا۔ وہ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا تھا مگر مالی طور پر ذرا بھی مستحکم نہ تھا۔ اس نے اپنی اس کم مائیگی کا اظہار کئی مرتبہ راحت سے کیا بھی تھا' مگر وہ صابر و شاکر لڑکی ہمیشہ مدبرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیتی۔ "آپ خواہ مخواہ ہی غریبی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ آخر ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ دو وقت کی روٹی خدا عزت سے دیتا ہے۔ سر چھپانے کو یہ جگہ بھی ہے۔"

مراد چڑ کر کہتا۔ "تم آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہو' کس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہی ہو! دو وقت کی دال روٹی اور اس بوسیدہ کوارٹر کے لیے جسے تم گھر کہتی ہو؟ ارے بیوقوف عورت! میں تو ساری دنیا تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا ہوں اور دیکھنا میں بہت جلد اپنا عہد پورا کروں گا۔"

ایسے مواقع پر وہ ہمیشہ اسے سمجھاتی۔ "یہ خواہ مخواہ کی حرص بلاجواز ہے۔ خدا نے ہمیں چاند سی بیٹی بھی دے دی ہے۔ بھلا اب اور کیا چاہیے؟" مگر مراد نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کے لیے ڈھیروں خوشیاں خریدنے کی خواہش کے لیے ذلت کی گہرائیوں میں جا پہنچا۔

اور آج جب وہ لوٹ رہا تھا تو اسے گزرے وقت کے سود و زیاں کا مکمل احساس تھا۔ دوسری جانب اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اتنے برسوں اس کا کوئی رابطہ اس سے نہ ہو سکا تو اب اسے کیسے ڈھونڈے گا۔ اب تو اس کی بچی بھی چھ سات سال کی ہو چکی ہو گی۔ ان ہی سوچوں کے دوران اس کا دھیان ظفر اقبال کی جانب لوٹ گیا جسے وہ بھارت ساتھ لے کر گیا تھا اور جو اجنبی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا۔ وہ تو آخری بار اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پایا تھا جس پر مرنے کے بعد مراد کے لیے بہت سارے پیغامات ہوں

گے۔ اس کی ضعیف ماں اور جوان بہنوں کی خوشیوں کا قاتل وہ خود ہی کو سمجھتا تھا۔

انہی سوچوں میں گم وہ حیدر آباد پہنچ گیا۔ سفر کے دوران رات کو ایک لمحے کے لیے بھی نیند اس کے نزدیک نہیں پھٹکی تھی۔ اسٹیشن سے وہ سیدھا اسی علاقے کی طرف روانہ ہوا جہاں کبھی اس کا گھر تھا۔ نرسری اور قریبی کچی آبادی کا نام تک وہاں نہ تھا بلکہ خوبصورت کوٹھیوں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اب اس کی واحد امید لطیف آباد نمبر ۸ میں واقع رحیم دین کا مکان تھا۔

رحیم دین راحت کے باپ عبدالکریم کا اکلوتا دوست تھا۔ جب وہ رکشے سے اتر کر رحیم دین کے چھوٹے سے مکان کی جانب بڑھا اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اتفاق سے بوڑھے رحیم دین نے ہی دروازہ کھولا۔

اس عرصہ کے دوران رحیم دین کی کمر جھک گئی تھی۔ مراد نے اس کو سلام کیا تو وہ آنکھوں پر ہاتھ کر خاصی دیر اسے بغور دیکھتا رہا۔ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ تبھی مراد نے کہا۔ ”چاچا رحیم دین! میں مراد ہوں.......... عبدالکریم کا داماد۔“

رحیم دین اسے پہچانتے ہوئے بولا۔ ”آجاؤ مراد بیٹے! اندر آجاؤ۔“

مراد چپ چاپ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت رحیم دین کا بیٹا اور بہو وغیرہ بچوں سمیت کسی عزیز کی شادی میں شریک ہونے کراچی گئے ہوئے تھے' لہٰذا رحیم دین نے مراد کو چھوٹے بیڈ روم میں لے جا کر بٹھا دیا جسے شاید ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

”بیٹھو بیٹا! میں تمہارے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔“ مراد اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

”چاچا! تم یہ تکلفات رہنے دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ راحت اور اس کے ابا آج کل کہاں رہتے ہیں؟“

رحیم دین کوئی جواب دیے بغیر مراد کو دیکھتا رہا۔ پھر قدرے سخت لہجے میں اس نے

کہا۔ ”پہلے تم یہ بتاؤ کہ اگر زندہ تھے تو اتنے سال کہاں غائب رہے؟“ مراد نے التجا کی' ”چاچا! یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لو کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا مگر تم راحت کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“ بوڑھا رحیم دین اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا مراد! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی اب تو راحت..........“

مراد نے جلدی سے کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا ہے؟“

رحیم دین بولا۔ ”نہیں وہ ٹھیک ٹھاک ہے مگر اب وہ تمہاری راحت نہیں رہی بلکہ میری بہو بن چکی ہے۔“

مراد کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ سنا ہے اس کا مطلب وہی ہے جو رحیم دین اسے جتا رہا ہے۔ خاصی دیر بعد وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے خالی نگاہوں سے رحیم دین کو دیکھتا رہا' پھر ٹوٹی پھوٹی آواز میں بڑبڑایا۔ ”مجھے راحت سے یہ توقع نہ تھی۔“

رحیم دین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بیٹا! پتہ نہیں تم دونوں میں سے کون کس کی توقعات پر پورا نہیں اترا مگر جو میں نے بتایا ہے حقیقت وہی ہے!“

رحیم دین کے الفاظ خنجر کی طرح اس کے سینے میں اتر گئے۔ مراد کو اپنے کانوں پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو راستے بھر یہی سوچتا آیا تھا کہ اتنے سال غائب رہنے کا کون سا عذر وہ اپنی ”بجنی“ کے سامنے پیش کرے گا۔ مگر یہاں تو اس کی کائنات ہی لٹ گئی تھی۔ وار اتنا گہرا تھا کہ وہ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ میری ننھی بیٹی کس حال میں ہے۔

ابتدائی صدمے سے سنبھلنے میں اسے کافی دیر لگی تھی۔ آخر خود کو سنبھالتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا۔ ”چاچا رحیم دین! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے مجھے ساری بات صحیح صحیح بتاؤ۔ میں کسی مزید صدمے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے بتاؤ میری ننھی بیٹی فاطمہ کس حال میں ہے۔ راحت کہاں ہے اس وقت؟“

بوڑھا رحیم اس پر گزرنے والی قیامت کو محسوس کر رہا تھا۔ مراد کے چہرے کے اتار

چڑھاؤ بغور دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "بیٹا مراد! مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تمہاری اچانک آمد پر خوشی کا اظہار کروں یا پھر تم سے تعزیت کروں۔ تم نے آنے میں بہت دیر کردی مراد۔ آخر تم کہاں گم ہوگئے تھے؟"

مراد قدرے تلخ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں اتنی مدت کہاں رہا؟ بعد میں بتادوں گا' مگر آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ میری بیٹی اور بیوی کس حال میں ہیں؟"

رحیم دین دکھی لہجے میں بولا۔ "مراد! اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ تمہارے جانے کے چند ماہ بعد ہی تمہاری ننھی بیٹی ٹائی فائڈ کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ تمہاری بیوی راحت کا باپ عبدالکریم بھی کچھ بیماری اور کچھ تمہاری گمشدگی کا صدمہ زیادہ دیر برداشت نہ کرپایا اور راحت اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس کے باوجود اس لڑکی نے جس حوصلے اور صبر کا مظاہرہ کیا وہ اسی کا حصہ ہے۔ نرسری اور کوارٹر وغیرہ سرکار نے خالی کرالیے۔ راحت کا اور کوئی عزیز تو تھا نہیں لہٰذا ہمیں ہمارے پڑوس میں ایک کمرے کا کوارٹر کرائے پر لے کر رہنے لگی۔ گزر اوقات کے لیے محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھاتی۔ اس کے علاوہ سلائی وغیرہ کرکے اپنا پیٹ پالتی رہی۔ مگر اس خدا کی بندی نے اپنے کردار پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔"

یہ کہہ کر بوڑھا غالباً سانس لینے کے لیے رک گیا تھا۔ مراد سانس روکے اپنے لٹنے کی داستان سن رہا تھا۔ بے ساختہ بولا۔ "پھر کیا ہوا چاچا رحیم دین؟" رحیم اٹکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہونا کیا تھا۔ وہ غریب ہر آن تمہاری منتظر رہی۔ ہر طرح سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ تمہارے والد کے پاس بھی پتہ کرنے گئی مگر انھوں نے نہایت ذلت آمیز طریقے سے دروازے ہی پر سے رخصت کردیا۔ ہر شخص سے تمہاری بابت پوچھتی مگر کہیں سے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر تمہارے دوست ظفر اقبال کے گھر سے معلوم ہوا کہ ظفر چند دیگر پاکستانیوں کے ہمراہ بھارتی جیل میں مارا گیا ہے تو

اس بے چاری کی آخری امید بھی جاتی رہی۔ سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ ظفر کے ساتھ تم بھی موت کے منہ میں چلے گئے ہو۔ ہم سبھی اس لڑکی کو کہتے کہ اتنی پہاڑ جیسی زندگی کس آسرے پر گزرو گی؟ مگر وہ بے وقوف لڑکی کہتی۔ "چاچا! میں بے آسرا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ ہر پل میرے میرے مراد کی یادیں رہتی ہیں۔ اسے یقین کامل تھا کہ تم ایک روز لوٹ آؤ گے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ آس کی ڈوری ٹوٹتی چلی گئی۔ وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔

"محلے کے سب چھوٹے بڑے اس کی شرافت کے سبب اس کی عزت کرتے تھے مگر اس مسئلے کا حل کسی کے پاس بھی تو نہیں تھا۔ جب تمہیں لاپتہ ہوئے پانچ برس بیت گئے تو محلے کے سبھی بزرگوں نے اسے مشورہ دیا کہ اب مراد کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ عقد ثانی کرلے' مگر وہ تو ایسی بات سننے کی بھی روادار نہ تھی۔ ایسی صورتِ حال میں محلے کے بزرگ خطیب مولوی یحیٰی نے مذہب و اخلاق کے سبھی تقاضوں کا حوالہ دے کر اسے قائل کرلیا کہ اب اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ اگر اولاد ہی ہوتی تو وہ اس کے سہارے زندگی گزار دیتی۔ لہٰذا خود میں نے بھی اس سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو میں اپنے بیٹے محمد شریف سے اس کا نکاح کر دوں جس کی بیوی کچھ عرصہ پہلے دو کم سن بچوں کو چھوڑ کر وفات پاگئی تھی۔

"کچھ عرصہ تو وہ پس و پیش کا مظاہرہ کرتی رہی۔ مگر سات ماہ پہلے اس نے شادی کی ہامی بھرلی اور اب ماشاءاللہ شریف کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کررہی ہے۔ بلکہ میرے دونوں کم سن پوتوں کو اس نے وہ پیار دیا ہے جو حقیقی ماں بھی مشکل سے دے پاتی۔ ویسے وہ اب بھی ہر دم کھوئی سی رہتی ہے اور ہر بات میں تمہارا ذکر لے بیٹھتی ہے۔ وہ چند روز قبل ہمارے عزیزوں کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئی ہوئی ہے اور امید ہے آج کل میں واپس آجائے گی۔"

مراد بت بنا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے بوڑھے کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس

ہو رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ کن سہانے سپنوں کے ساتھ وہ واپس لوٹا تھا مگر منزل پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ منزل اس سے ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی ہے۔ گھر واپسی پر اسے پہچاننے والی کوئی ہستی باقی نہیں بچی تھی۔ کوئی شخصیت ایسی نہ رہی تھی جو بتاتی کہ اس کے بنا سُونے موسم کیسے بیتے ہیں۔

ابھی وہ دونوں باتوں ہی میں مصروف تھے کہ گھر کے باہر رکشہ کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد دو ننھے منے بچے بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اپنے دادا کے پاس ایک اجنبی کو بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تبھی بیرونی دروازہ کھلا اور کوئی دوسرا اندر داخل ہوا۔

مراد دروازے کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والی شخصیت کوئی اور نہیں اس کی راحت تھی۔ جس نے سادہ پرنٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ مگر اس سادگی میں بھی چہرے کی معصومیت نے اس کی شخصیت میں خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ مراد کو سامنے دیکھ کر وہ یک دم مبہوت سی ہو گئی تھی۔

ایک پل میں جانے دونوں اطراف کتنی قیامتیں گزر گئیں۔ راحت کے چہرے پر چند ثانیوں میں کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ جن میں بے پایاں مسرت کا رنگ سب پر غالب تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ انداز میں مراد کی جانب اٹھے تھے۔ لگتا تھا جیسے مراد کو اپنی آغوش میں بھر لینا چاہتی ہو، مگر یہ کیفیت لمحاتی تھی۔ چند قدم اٹھانے کے بعد پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے اور پھیلے ہوئے ہاتھ غیرارادی طور پر نیچے ہو گئے۔

البتہ آنکھیں زبان بن گئی تھیں۔ دل پگھل کر آنکھوں میں تیرنے لگا۔ صورتِ حال کی سنگینی محسوس کر کے بوڑھا رحیم دین کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ دونوں بت بنے کتنی ہی دیر اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا گویا کائنات تھم گئی ہو اور آج کے بعد کاروبارِ حیات میں کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ خاموشی کا یہ سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگر راحت آگے بڑھ کر

مراد کو کندھے سے نہ جھنجھوڑتی۔ "مراد! یہ تمہی ہو نا! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟"

مراد اس کا ہاتھ نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "کاش! یہ خواب ہی ہوتا مگر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا راحت؟" وہ گویا خواب سے جاگ گئی تھی۔ کس قدر تلخ انداز میں بولی۔ "مراد! خدا کے لیے مجھے قصور وار نہ ٹھہرانا۔ میں نے تمہارا جتنا انتظار کیا، وہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ بچی کی وفات کی بعد تمہاری راہ تکتے مجھ پر جو گزری ہے شاید ہی تم اس کا اندازہ لگا سکو۔ ایک ایک پل میں نے کیسے کاٹا، اب اس کے ذکر سے کیا حاصل؟ کاش! تم کسی طرح مجھے اطلاع دے دیتے کہ تم زندہ ہو تو میں ساری عمر تمہارے نام کے سہارے گزار دیتی۔ مگر تم تو ایسے گئے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے اور حالات کی گردش نے آج ہمیں ملایا بھی ہے تو کس موڑ پر........"

مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جذبات سے عاری آواز میں بولا۔ "راحت! میں تمہیں کسی طرح قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہ تھے۔ ویسے کنارے پر پہنچ کر ڈوب جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

راحت سامنے بیٹھ کر ٹھہرے ٹھہرے الفاظ میں خود پر گزرنے والی قیامت سے اسے آگاہ کر رہی تھی۔ "........ اور پھر میں نے سب کے مجبور کرنے پر شادی کر لی اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ صرف نام کا شریف نہیں بلکہ حقیقتاً ایک شریف النفس انسان ہے۔ اگرچہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میرے دل و دماغ پر تم ہی سوار تھے، مگر اس نیک شخص نے کبھی میری تضحیک نہیں کی بلکہ ہر ممکن طریقے سے تمہاری کھوج میں مصروف رہا۔ اس کے دونوں معصوم بچے بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، اور اب تو چند ماہ تک میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

مراد اب خود پر مکمل قابو پا چکا تھا۔ "راحت! مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی راہِ وفا سے نہیں بھٹکا۔ مگر حتمی فیصلے تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ شاید اسے ہمارا دائمی سنجوگ منظور نہیں تھا، لہٰذا اس طریقے سے ہمیشہ کے لیے ہماری راہیں جدا کر دی

گئیں۔ خدا تمہیں اور شریف کو خوش رکھے۔ گزرا ہوا وقت مکمل طور پر بھول جانے کی کوشش کرنا۔ یہ سمجھ لو کہ وہ ایک بھیانک خواب تھا۔"

راحت کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ "مراد! اس وقت کو بھیانک خواب مت کہو۔ وہ تو ایسا سہانا سپنا تھا جس کے تصور کے سہارے تمام زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ وہ دور تو میری زندگی کا حاصل ہے مگر اب........" یہ کہہ کر اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا تاکہ مسلسل گرنے والے اشکوں کے سیلاب سے دونوں ہی بہہ نہ جائیں۔

مراد سپاٹ آواز میں بولا۔ "اپنے آنسو تھام لو راحت ورنہ یہ ہم دونوں کے ارادوں کو متزلزل کردیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد رحیم دین اور شریف بھی آگئے۔ شریف مراد سے بڑی اپنائیت کے ساتھ ملا۔ راحت نے کھانا تیار کیا اور سبھی نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا' لیکن اپنی جگہ سبھی ایک جیسے خیالات میں گم تھے۔ مراد اس ماحول میں مزید رک کر سبھی کا سکون برباد نہیں کرنا چاہتا تھا' لہٰذا کھانا کھانے کے بعد بولا۔ "اچھا بھئی شریف صاحب! میں آج شام واپس لاہور جانا چاہتا ہوں' جہاں چند ضروری کام نپٹانے ہیں۔"

راحت نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کے شکوے تھے۔ اس کے باوجود اسے روکنے کے لیے کسی نے اصرار نہ کیا کیونکہ اس کی ذہنی کیفیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ بھی ان لوگوں سے رابطہ رکھے گا۔ راحت اور شریف کا اصرار تھا کہ وہ دونوں اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ کر آئیں گے مگر اس نے ملائمت سے انہیں منع کردیا۔ شریف نے باہر جاکر رکشے کا بندوبست کیا۔

رخصت ہوتے وقت راحت شکستہ لہجے میں بولی۔ "اپنا خیال رکھنا مراد!" اس کے ان الفاظ میں چھپی اپنائیت محسوس کرکے جانے کیوں مراد کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

رکشہ روانہ ہونے کے بعد بوڑھا رحیم دین راحت کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "بیٹی! معلوم نہیں اس کا نام مراد کس نے رکھا تھا۔ یہ بے چارہ تو ساحل مراد پر پہنچ کر بھی نامراد ہی لوٹا ہے۔" راحت نے کوئی جواب دیے بغیر دوپٹے کے پلو سے اپنی پلکوں کے بھیگے کونے صاف کیے اور گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

☆=====☆=====☆

واپسی کے سفر میں مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جب ریل گاڑی حیدر آباد اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو اسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو' اور اس کے جسم کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو کر وہیں رہ گیا ہو۔ وہ خود کو بڑا کھوکھلا سا محسوس کر رہا تھا۔ بظاہر اس کی نظریں کھڑکی کے شیشے پر جمی تھیں مگر ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔

سب کچھ تباہ ہونے کے بعد اسے مزید زندہ رہنے کا کوئی جواز سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ اب وہ کس لیے اور کس کے لیے جینا چاہتا ہے۔ تبھی اس کے ذہن میں ظفر اقبال کا خیال آیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے عجیب شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہو کہ مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔ کیا میرے گھر والوں کا تم پر کوئی حق نہیں؟ یہ خیال آتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوراً اس کے گھر جا کر اس کی ضعیف ماں اور بہنوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے گا۔

حاصل پور پہنچنے کے بعد اسے ظفر کے محلے تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ وہ چھ سال قبل آخری بار اس چھوٹے سے محلے مسلم آباد میں آیا تھا۔ اب اس کی آبادی خاصی پھیل چکی تھی۔ چوک میں تانگے سے اترنے کے بعد اپنی یادداشت کے مطابق اس نے ظفر کے گھر کا رخ کیا۔ پتلی سی گلی کے آخری سرے پر واقع مکان کے دروازے پر پہنچ کر وہ کچھ ٹھٹک سا گیا کیونکہ پہلے یہ مکان محض دو پرانے کمروں پر مشتمل تھا جبکہ اس وقت اس کے سامنے خوبصورت تین منزلہ عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی اور جس دروازے پر ٹاٹ کا پرانا سا پردہ جھولا کرتا تھا' اس کی جگہ لوہے کے بڑے سے گیٹ نے لے لی تھی۔

کال بیل کا بٹن دبانے کے چند لمحوں بعد گیٹ کا چھوٹا بغلی دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نے سر باہر نکال کر جھانکا اور سوالیہ نگاہیں مراد کی جانب اٹھیں۔ مراد چند لمحوں کے لیے کچھ سٹپٹا سا گیا تھا۔ "جی یہ ظفر اقبال صاحب ہی کا مکان ہے نا؟"

اجنبی شخص نے اسے مشکوک انداز سے گھورتے ہوئے بولا۔ "کون ظفر اقبال؟ میاں ہم گزشتہ تین سال سے اس میں رہ رہے ہیں۔"

مراد کچھ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ "جناب! یہاں چند سال پہلے ظفر نام کے صاحب رہتے تھے۔ ان کی والدہ کا نام سکینہ بی بی تھا۔" وہ مراد کی بات اچکتے ہوئے بولا۔

"آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"جی میں ان کا عزیز ہوں۔"

وہ شخص غالباً بحث کی موڈ میں تھا۔ باہر آ کر اس نے کہا۔ "آپ کیسے عزیز ہیں جنہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ سکینہ بی بی انتقال کر چکی ہیں۔"

مراد کو یہ سن کر صدمہ ہوا' مگر اس شخص کی جرح سے تنگ آتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں خاصا عرصہ بیرون ملک رہا ہوں لہٰذا ان کے موجودہ احوال سے واقف نہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکیں تو مہربانی ہو گی۔"

وہ شخص کچھ نرم پڑتے ہوئے گویا ہوا۔ "میرا نام محمد دین ہے۔ ہم نے چند سال پہلے نور بانو سے یہ مکان خریدا تھا۔"

مراد کو علم تھا کہ ظفر کی بہنوں میں سے بڑی کا نام نور بانو ہی تھا۔ جلدی سے بولا۔

"جی دراصل مجھے اسی سے ملنا ہے۔ کیا آپ کو ان کا موجودہ ایڈریس معلوم ہے؟"

ادھیڑ عمر محمد دین چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر جواب دیا۔ "وہ فیصل کالونی تھانے کے پاس ہی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

مراد کو اس کا یہ رویہ خاصا گراں گزرا تھا مگر کیا کر سکتا تھا۔ دھیرے سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ واپس چوک میں آ کر اس نے فیصل کالونی کے لیے تانگہ لیا۔ اس دوران اس کا

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔

دس منٹ کا سفر کر کے اس شہر نما قصبے کے نواح میں پہنچ کر تانگے والے نے کہا۔

"باؤ جی! یہی فیصل کالونی ہے۔"

اترتے ہوئے مراد نے چاروں جانب نگاہ ڈالی تو احساس ہوا کہ بہت صاف ستھری آبادی ہے۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد آگے بڑھا تو چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جنرل سٹور سے اس نے تھانے کے قریب رہائش پذیر نور بانو کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا داہنی سڑک پر چوتھی کوٹھی اسی کی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے دکان دار نے معنی خیز نظروں سے اسے گھورا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "جناب! بھلا نور بانو کو کون نہیں جانتا؟ وہ تو یہاں کی ممتاز شخصیت ہیں۔"

مراد کو اس شخص کا لہجہ اور انداز عجیب سا لگا تھا۔ بہرحال وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک کوٹھی نما مکان کے باہر کھڑا تھا۔ بیل بجانے کے چند لمحوں بعد ایک عمر رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا۔ "جی آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

مراد کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا' مگر اپنی حیرانی کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "محترمہ نور بانو گھر میں ہیں تو انہیں بلا دیں۔"

بوڑھی عورت کی نگاہوں میں عجیب سی شیطانی چمک سی لہرائی۔ "آئیں صاحب جی! آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں بانو بی بی کو اطلاع کرتی ہوں۔"

مراد اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر خوبصورت قالین بچھا تھا اور دیوار کے ساتھ قیمتی صوفے بڑی ترتیب سے رکھے تھے۔ کھڑکی اور دروازوں پر ملتے جلتے رنگوں کے پردے لہرا رہے تھے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے بوڑھی خادمہ کمرے سے نکل گئی۔

مراد کو یہ سارا گورکھ دھندا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ تو راستے بھر سوچتا آیا تھا کہ یہ

بدنصیب خاندان جانے کس طرح دو وقت کی روٹی پوری کر رہا ہو گا' مگر یہاں تو ساری صورتِ حال ہی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی اور اس کی کوئی فوری توجیہہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک بار تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہے ورنہ ظفر کی بہن بھلا ایسے ٹھاٹھ باٹھ کی متحمل کیسے ہو سکتی ہے! ممکن ہے یہ نور بانو کوئی دوسری خاتون ہو۔

وہ ابھی اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ پردہ ہٹا کر نور بانو اندر داخل ہوئی۔ اس کی چال ڈھال میں ایک خاص قسم کا طمطراق تھا لیکن سامنے بیٹھے مراد کو دیکھ کر وہ یکدم ٹھٹک سی گئی تھی۔ وہ درجنوں بار ظفر اقبال کے گھر آ چکا تھا۔ لہٰذا اس کی ماں اور بہنیں اسے اچھی طرح جانتی تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

نور بانو کے چہرے کی شادابی ایک لمحے ہی میں زردی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ مراد صاحب ہی ہیں' ظفر بھائی کے عزیز ترین دوست۔"

مراد فوراً کچھ نہ بول سکا۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں نور بانو! میں ہی ہوں۔"

وہ قدرے تلخ لہجے میں کہہ اٹھی۔ "تو مراد صاحب! آپ واپس آ ہی گئے مگر اکیلے۔ میرا بھائی ظفر کہاں ہے جسے آپ دولت مند ہونے کا سپنا دکھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے؟"

مراد افسوس اور ندامت کی زیادتی سے فرش پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا بھائی وہاں جا چکا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہ کیفیت خاصی دیر برقرار رہی۔ اس خاموشی کو بانو ہی نے ختم کیا۔ "مراد صاحب! مجھے معلوم ہے میرا اکلوتا بھائی اب کبھی واپس نہیں آئے گا کیونکہ وہ منوں مٹی اوڑھے بھارت میں کسی جگہ ابدی

نیند سو رہا ہے۔ اپنی بہنوں کو سہاگنوں کا روپ دینے کا خواب لیے وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ چند سال پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔" اس کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا' مگر آنکھوں کے بھیگے گوشے اندرونی کرب کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس نے بظاہر کوئی تلخ بات نہیں کہی تھی۔ اس کے باوجود اس کا ہر لفظ مراد کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا کیونکہ اسی نے ظفر کو بھارت جانے کے لیے اکسایا تھا اور یہ بات بانو سمیت ظفر کے سبھی گھر والوں کو معلوم تھی۔ اسی وجہ سے مراد اس سانحے کے لیے خود کو ذمے دار سمجھتا تھا۔ اپنے حواس بمشکل مجتمع کرتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "بانو! میں تم سب لوگوں کا مجرم ہوں۔ اصل میں ظفر کا قاتل میں ہی ہوں۔ تم جو بھی سزا دو مجھے منظور ہے۔"

بانو اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی نہایت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "مراد صاحب! اب اس ذکر کا کیا فائدہ۔ شاید اسی کا نام تقدیر ہے۔ ویسے تمہیں کیا معلوم ظفر کے چلے جانے سے ہمارا کیا کچھ کھو گیا۔ تم کس کس جرم کی سزا بھگتو گے؟" وہ اب قدرے تلخ ہو گئی تھی اور آپ سے تم پر اتر آئی تھی۔

اس کا لہجہ خاصا جارحانہ ہو چلا تھا۔ "کیا تمہیں سزا دینے سے میرا ماں جایا واپس آجائے گا؟ کیا تم بوڑھی ماں کی پتھرائی آنکھوں میں زندگی ڈال سکتے ہو جو بیٹے کے انتظار سے مایوس ہو کر خود بھی اسی کے پاس چلی گئی؟ اور پھر کیا تم میری آبرو واپس دلا سکتے ہو جو قدم قدم پر پامال کی گئی۔ میرے اس کڑیل اور معصوم بھائی کا کون سا نعم البدل ہے تمہارے پاس جو بہنوں کی طرف میلی نگاہ اٹھانے والے کی آنکھ نکالنے کی جرأت رکھتا تھا؟ مسٹر مراد! یہ رسمی باتیں رہنے دو۔ ہم بھی اسے بھلا چکے ہیں۔ اگر بتانا ہی ہے تو یہ بتاؤ کہ میرے ماں جائے نے آخری لمحات میں مجھے یاد کیا تھا یا نہیں اور کیا اس کی قبر کا کوئی نشان باقی ہے جہاں جا کر میں فاتحہ پڑھ سکوں؟"

اسی دوران ملازمہ چائے لے کر اندر آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر بانو نے خود پر قابو پالیا

تھا' لیکن اس بوڑھی کی جہاندیدہ نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں تیرنے والے آنسو نہیں چھپے تھے' تاہم وہ کسی قسم کا اظہار کیے بغیر باہر نکل گئی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نو وارد عام قسم کا مہمان نہیں بلکہ اس کا کوئی خاص پس منظر ہے۔

مراد گم صم بیٹھا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جسے چند برس پہلے ڈھنگ سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ مگر آج اس کے کسی سوال کا جواب مراد کے پاس نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھاری آواز میں بولا۔ "نور بانو! مجھے احساس ہے کہ یہاں آکر میں نے تمہارے پرانے زخم ہرے کر دیئے ہیں لہٰذا اب مجھے اجازت دو۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہو گی۔"

بانو تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "مسٹر مراد! یہ زخم بھرے ہی کب تھے۔ یہ تو زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ مجھے پتہ ہے میری باتوں سے آپ کو صدمہ ہوا ہے' مگر کیا کروں آخر میں ظفر کی بہن ہوں۔ آج عرصے بعد ایک ہمدرد کو سامنے دیکھا تو خود پر قابو نہیں رہا۔ ویسے آپ ابھی جانے کا خیال بھول جائیں۔ ابھی تو میں نے آپ کی خیریت بھی دریافت نہیں کی۔ ہماری راحت بھابی کس حال میں ہیں۔ وہ تو اتنے عرصے بعد آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے پاگل سی ہو گئی ہوں گی۔"

مراد نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔ "اس ذکر کو رہنے دو بانو! اسے سن کر مزید دکھی ہو جاؤ گی۔" پھر اس نے نور بانو کے اصرار پر راحت کی دوسری شادی اور اپنی بچی کے انتقال کی بابت اسے تفصیل سے بتا دیا۔

نور بانو نے اس دوران اسے ٹوکا نہیں تھا اور بات مکمل کرنے کا موقع دیا تھا۔ آخر میں اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو آپ بھی اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں' لیکن میں اس پر افسوس کا اظہار اس لیے نہیں کروں گی کہ ان رسمی باتوں سے اب مجھے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ بہرحال شاید اسی کا نام زندگی ہے۔" اس دوران اس نے ملازمہ کو بلا کر ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بھی ملاقاتی آئے تو اسے بتا دیا جائے کہ بی بی گھر پر نہیں۔

سگریٹ سلگانے کے بعد مراد نے دھیرے سے کہا۔ "نور بانو! ایک بات میرے ذہن

میں دیر سے کھٹک رہی ہے اگر محسوس نہ کرو تو میں پوچھنا چاہوں گا کہ ظفر کے بعد تم لوگوں نے اپنے معاشی مسائل کیسے حل کیے۔ تم لوگوں کی مالی حالت بظاہر ایسی نہ تھی کہ حالات معمول کے مطابق چلتے رہتے۔"

وہ شاید پہلے ہی اس سوال کی منتظر تھی۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی اور پھر سپاٹ انداز میں کہنے لگی۔ "مراد! آپ ہمارے گھر کی معاشی زبوں حالی سے تو واقف ہی ہیں۔ ظفر تمہارے ساتھ چلا گیا' ماں کو ایک بہتر مستقبل کا سپنا دکھا کر۔ مگر کسے معلوم تھا کہ اس خواب کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی۔ جب تم لوگوں کو گئے کئی ماہ بیت گئے تو ہماری مالی حالت مزید پتلی ہوگئی۔ جب تم لوگوں کو گئے کئی ماہ بیت گئے تو ظفر بھائی بس کنڈکٹری سے جو تھوڑے بہت پیسے لاتے تھے ان سے دال روٹی چل جاتی تھی۔ جو تھوڑا بہت پس انداز کیا تھا وہ بھی چند ماہ میں ختم ہوگیا۔ ماں نے بیٹیوں کے بیاہ کی خاطر جو چند تولے زیور بچا کر رکھا تھا اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی آخر کتنا عرصہ ساتھ دیتی۔"

یہ کہہ کر بانو خاموش ہوگئی تھی۔ آنکھوں میں حسرت و یاس کے سائے لہرانے لگے تھے۔ مراد بت بنا اسے دیکھے جارہا تھا۔ اپنی بات مزید آگے بڑھاتی ہوئی چند ثانیوں بعد وہ بولی۔ "ماں کی حالت بیٹے کی جدائی اور معاشی بدحالی نے مزید بگاڑ دی تھی۔ پہلے تو وہ ارد گرد سے سلائی کے کپڑے لے آتی تھی۔ ہم چاروں بہنیں سی کر دال روٹی چلاتی تھیں' لیکن ماں کی بیماری سے یہ سلسلہ بھی بند ہوتا دکھائی دیا۔ اس مرحلے پر سب سے بڑی ہونے کے ناتے مجھے گھر سے باہر نکلنا پڑا۔"

وہ چند لمحوں کے لیے ماضی کی یادوں میں کھو کر خاموش ہوگئی تھی۔ پھر خود ہی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ "یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں تب بھی روزگار کے مواقع انتہائی محدود تھے۔ قصبے کے اکلوتے پرائیویٹ ہسپتال فراز کلینک میں مجھے ان ٹرینڈ نرس کی ملازمت مل گئی جہاں سے چند سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ کھاتے پیتے مریض صحت یاب ہونے پر بعض اوقات بخشش بھی دے جاتے۔ ۱۹۷۶ء کے آخری

مہینے میں قریبی گاؤں کا ایک سمگلر رسول بخش بھارتی قید کاٹ کر آیا تو اس نے ظفر کی موت سے آگاہ کیا۔ یہ منحوس خبر سننے کے بعد بوڑھی ماں چند روز بعد ہی ہم بہنوں کو تنہا چھوڑ کر ابدی نیند جا سوئی۔ مرنے کے بعد بھی اس ضعیف عورت کی آنکھیں اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنے کی آس میں کھلی رہیں۔ اس سانحے کا ایک ایک لمحہ آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ بے سہارا عورت کو جب یقین ہوگیا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے تو اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ اس ماں کی حالت کا اندازہ تم بآسانی لگا سکتے ہو۔ جس کی چار بچیوں کا اس کے بعد دنیا میں کوئی دوسرا سہارا نہ ہو۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ شاید وصیت یا نصیحت کے لیے اس کے پاس بچا ہی کچھ نہ تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد ہم بہنوں کے لیے دنیا اندھیرا ہوگئی تھی۔ لگتا تھا وقت کا پہیہ تھم گیا ہے' لیکن وقت بھی کبھی رکا ہے۔ محلے داروں اور دور پار کے رشتے داروں نے ترس کھا کر ماں کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے۔ ہمیں دلاسے دیئے گئے' صبر کی تلقین کی گئی' مگر یہ سب کچھ محض چند روزہ تھا۔ اس کے بعد اس وسیع و عریض زمین پر ہم تنہا کھڑی تھیں اور دور دور تک آس کا ہلکا سا سایہ بھی نہ تھا۔

"کچھ دنوں بعد میں نے اپنی ملازمت پر دوبارہ جانا شروع کردیا' لیکن چند ہی روز میں احساس ہوا کہ ضعیف ماں نے اپنی ناتوانی کے باوجود ہم بہنوں کو اپنے پروں کے نیچے محفوظ کر رکھا تھا۔ برگد کا وہ بوڑھا مگر سایہ دار پیڑ کیا گرا' ہم سارے جہاں کے لیے تماشا بن کے رہ گئیں۔ میں شام کو تھکی ہاری کام سے واپس آتی تو محلے کے چوک سے گھر کی دہلیز تک کئی بھبتیوں کا سامنا کرتی۔ اچھے بھلے لوگ آوازے کستے اور میری نوکری اور کردار کے حوالے سے عجیب و غریب تبصرے کیے جاتے حتیٰ کہ میرے ہونے والے سسرال نے ہمارے گھر آکر منگنی توڑنے کا اعلان کردیا۔

"چند ماہ تو میں یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن یہ سلسلہ رکنے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔ آس پڑوس کی اکثر ماؤں نے اپنی بہو بیٹیوں کو ہمارے گھر آنے سے منع کردیا کیونکہ

ان کے خیال میں ہم بہنیں شریفوں سے میل جول کے قابل نہیں رہی تھیں۔ میں یہ سب برداشت کر جاتی، مگر اپنی تین چھوٹی جوان بہنوں کی ذمے داری کا احساس مجھے اندر سے چاٹ رہا تھا۔ دو وقت کی روٹی تو جیسے تیسے پوری ہو رہی تھی لیکن جب ان کی شادی کا سوچتی تو دہل کر رہ جاتی۔ ماں اور بھائی راہی ملک عدم ہو چکے تھے اور جو زندہ بچے تھے ان کے لیے مجھے ہی سب کچھ کرنا تھا، لہٰذا میں نے بہت سوچ سمجھ کر ان دیکھی راہوں پر چلنے کا شعوری فیصلہ کر لیا۔"

مراد یہ سن کر بری طرح چونکا تھا۔ صوفے پر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا نہیں تم کن ان دیکھی راہوں کا ذکر کر رہی ہو۔"

اندر سے وہ اس کی بات سن کر بری طرح سہم گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔

نور بانو خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی تھی۔ لگتا تھا اس نے مراد کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "مراد صاحب! اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل میں نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔ مگر نہیں میں آج تمہیں بتا کر رہوں گی کہ تمہارے اور ظفر کے غلط فیصلوں اور زیادہ پیسہ کمانے کی بے جا خواہشات نے ہمیں کیسا "روشن مستقبل" فراہم کیا۔

"اس روز کے بعد سے میں نے وہ مکان چھوڑ دیا اور بہنوں کو لے کر دوسرے محلے میں منتقل ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ محنت مزدوری کرنے کے باوجود مجھے بے سروپا الزامات کا شکار ہونا پڑتا ہے تو کیوں نہ میں یہ تہمتیں اپنا مقدر بنا لوں۔ تبھی سے میں نے وہ راستہ اپنا لیا جو ہزاروں سال سے عورتوں کی قلیل تعداد نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد میں ایک مہذب طوائف بن کر رہ گئی۔"

مراد کا ذہن یہ تلخ سچائی قبول کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ سرزنش کے انداز میں اس نے کہا۔ "نہیں، نور بانو! ایسا مت کہو۔ کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔" مگر وہ مضبوط آواز

میں کہنے لگی۔ "نہیں، یہی تو ایک سچائی ہے، البتہ میں یہ حلفیہ کہتی ہوں کہ خود اس راہ پر چلنے کے باوجود میں نے اپنی بہنوں کی حفاظت ایسے ہی کی ہے جیسے کوئی بھی باکردار والدین کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی بداعمالیوں کو بڑے خوبصورت ڈھنگ سے چھپائے رکھا تاکہ میری بہنوں پر میری بدنامی کے چھینٹے نہ پڑ سکیں۔ میں نے دو سال کے عرصے میں تینوں کی شادی نسبتاً معقول مگر شریف گھرانوں میں کر دی جہاں وہ اب پرسکون ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میں نے اپنا پرانا مکان بیچ دیا تھا اور کرائے پر اس کوٹھی میں رہ رہی ہوں۔ کافی پیسہ اکٹھا کر چکی ہوں، لیکن کردار کے اعتبار سے اب بھی اسی روش پر قائم ہوں بلکہ اب تو میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔"

اس کی طویل مگر الم ناک داستان نے مراد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانی بھول کر اس معاشرتی سانحے پر آنسو بہا رہا تھا جس کی بالواسطہ ذمے داری خود اس پر بھی عائد ہوتی تھی۔ کمرے میں موت جیسی خاموشی طاری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ماتھے پر آیا ندامت کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے بولا۔ "بانو! اتنا کچھ سننے کے بعد مجھے سمجھ نہیں آتی اپنی صفائی میں کیا کہوں۔ شاید تم لوگوں کا اصل مجرم میں ہی ہوں۔ نہ میں ظفر کو ساتھ لے جاتا نہ یہ قیامت تمہارے گھرانے پر ٹوٹتی۔"

وہ متوازن لہجے میں بولی۔ "نہیں، یہ بات نہیں۔ تم خواہ مخواہ خود کو کوس رہے ہو۔ ہونی ہو کر رہتی ہے، البتہ اب اگر تم چاہو تو اپنے ذمے سبھی قرض چکا سکتے ہو۔"

مراد نے کسی قدر حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "بانو! تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر بتاؤ۔ میں اگر اس گھرانے کے کسی کام آ سکا تو شاید میرے ضمیر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔"

بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "جس روز میری ماں مری تھی، اس کی میت کے سرہانے بیٹھ کر میں نے دو عہد کیے تھے۔ ایک چھوٹی بہنوں کو ماں بن کر پالنے اور ان کی کفالت اور حفاظت کا عہد اور دوسرا اپنے بھائی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا حلف۔ میں پہلی ذمے داری تو نبھا چکی ہوں۔ میں نے ان تینوں کو اپنی بچیوں کی طرح ہر

آفت سے بچا کر ان کے گھروں کو روانہ کردیا ہے جہاں وہ سبھی خوش و خرم زندگی بتا رہی ہیں۔ اب مجھے اپنے ماں جائے کے خون کا حساب لینا ہے اور صرف ایک بار اس کی قبر پر جا کر آنسوؤں کے چند قطرے بہانے ہیں۔ ممکن ہے تمہارے نزدیک یہ بڑی فضول اور احمقانہ خواہش ہو' لیکن میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے' ورنہ تو اب اس بیسوائی میں جینے کی آرزو کس کو ہے؟"

مراد اس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا جو کام اسے کرنا چاہئے اس کی بابت ایک کمزور سی عورت سوچ رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ خونی رشتے شاید واقعی اٹوٹ ہوتے ہیں اور یہ دوستی وغیرہ محض کتابی باتیں ہیں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ انجانے خیالوں میں کھو گیا۔

بانو کافی دیر تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی' پھر دھیمے لہجے میں اس نے کہا۔ "تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے میں نے ایسے ہی تم سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کرلی ہیں۔ تم تو پہلے ہی خدا خدا کرکے ان کی قید سے رہا ہو کر آئے ہو۔ بھلا تم واپس کیوں جانے لگے؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

مراد نے اسے غصے سے گھورا اور جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ لفظ چباتے ہوئے بولی۔ "میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ تمہیں خود واپس بھارت نہیں جانا چاہئے' البتہ ہو سکے تو مجھے ان لوگوں کی تفصیل سے آگاہ کردو جو میرے بھائی کی موت کے اصل ذمے دار ہیں۔ باقی مسائل میں خود ہی حل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

مراد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔ وہ قدرے تاؤ کھا کر بولا۔ "نور بانو! تم اب میری توہین کررہی ہو۔ یہ درست ہے کہ ظفر تمہارا بھائی تھا' مگر میں ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ تمہیں وہاں اکیلا بھیج دوں۔ ویسے بھی اب یہاں میرے لئے کون سی دلچسپی باقی بچی ہے۔ یہاں رہوں گا تو زخم ہمیشہ ہرے رہیں گے۔ وقت بھی ان پر مرہم نہیں رکھ پائے گا۔ لہٰذا اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ بھارت چلوں گا۔ مجھے بھی وہاں

بہت سے حساب چکانے ہیں۔"

یہ سن کر بانو کے چہرے پہ بارونق سی آگئی تھی۔ تبھی ملازمہ ہلکی سی دستک کے بعد اندر داخل ہوئی۔ "بانو بیگم! اندھیرا چھا گیا ہے اور آپ نے ابھی تک بتی نہیں جلائی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے روشنی کا بٹن آن کردیا اور پھر بانو کی جانب مڑ کر کہا۔ "آپ کہیں تو کھانا لگا دوں؟"

بانو بولی۔ "نہیں' فی الحال تو چائے وغیرہ ہی لے آو۔ کھانا دیر سے کھائیں گے۔" اس کے بعد اس نے اپنی تینوں بہنوں کو فون پر پیغام دیا کہ وہ اگلے روز اس کے یہاں آئیں۔

اور دوسرے دن دوپہر تک وہ تینوں اپنے ننھے منے بچوں سمیت موجود تھیں۔ گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ وہ سبھی مراد کو پہلے سے جانتی تھیں' لہٰذا خاصی اپنایت سے ملیں اور شام کو لوٹ گئیں۔ مراد یا بانو نے ان میں سے کسی کو بھی اپنے آئندہ ارادوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

مراد نے ٹھنڈے ذہن سے جب اس مسئلے پر غور کیا تو اسے نور بانو کا بھارت جانا کچھ مناسب معلوم نہ ہوا' لہٰذا اس نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ پیشکش کی کہ وہ تنہا ہی یہ مشن کامیاب بنانے کی کوشش کرسکتا ہے' مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی اور مراد کی ایک نہ چلی۔

تب مراد نے جیل کے کئی پرانے دوستوں سے رابطہ کیا اور ان سے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور تیاریوں میں لگ گیا۔ بانو مالی لحاظ سے کافی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی تمام جمع پونجی اس کے سامنے ڈھیر کردی تھی۔ اس نے اس رقم کے عوض چند سمگلروں سے بھارتی کرنسی حاصل کی اور تمام تیاری مکمل ہونے کے بعد بانو کو اطلاع دی کہ اب ہم بھارت میں داخل ہونے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس مرحلے پر اس نے آخری کوشش کے طور پر بانو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ شام

کی چائے کے دوران وہ آہستگی سے بولا۔ "دیکھو' میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ وہاں جانا تمہارے لئے مناسب ہے نہ ضروری۔ یہ کام میں اکیلا بھی کر سکتا ہوں' لہٰذا......" وہ اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے بولی۔ "مراد! میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں۔ رہا عورت ذات ہونے کا سوال تو یہ خطرات تو ان شریف زادیوں کے لئے ہوتے ہیں جو واقعی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں تو جس راستے پر چل رہی ہوں وہ عورت کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ میں چاہوں بھی تو معاشرتی سطح پر مجھے اب وہ احترام میسر نہیں آسکتا جو ایک شریف عورت کا مقدر ہوتا ہے' لہٰذا جو نہیں مل سکتا اس کی خواہش ہی فضول ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو' وہاں میں تمہارے لئے مسئلہ نہیں بنوں گی بلکہ ممکن ہے میری موجودگی سے تمہارے لئے کچھ آسانیاں فراہم ہو جائیں کیونکہ تمہیں علم ہی ہے کہ بعض حالات میں ایک عورت وہ کام کر ڈالتی ہے جو سو مرد بھی مل کر نہیں کر سکتے۔"

مراد ابھی تک شش و پنج کا شکار تھا' لیکن بانو کے ارادے کی مضبوطی دیکھ کر مزید کچھ نہ بولا اور سفر کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

یکم اور دو جون ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب ان دونوں نے ایک اسمگلر کی مدد سے بین الاقوامی سرحد عبور کی اور بھارت میں داخل ہو گئے۔ ان کا گائیڈ برکت ساری عمر اسی سرحد کے آر پار چھوٹی موٹی اسمگلنگ کرتا رہا تھا' لہٰذا اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے انہیں جے پور پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ بھارت میں داخل ہونے کے بعد کرن پور سے وہ ایک پرانے سے ٹرک میں سوار ہوئے جسے برکت کا بااعتماد ساتھی شام سنگھ چلا رہا تھا۔

اگلی صبح نو بجے وہ سب جے پور میں چاند پول گیٹ کے باہر واقع محلہ پاتڑیاں کے چھوٹے سے مکان میں بیٹھے تھے جس کا انتظام شام سنگھ نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ مالک مکان کو ایک سال کا پیشگی کرایہ ادا کیا جا چکا تھا۔ انہیں وہاں چھوڑ کر برکت اور شام سنگھ

روانہ ہو گئے۔

یہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے خوابگاہ کے طور پر ایک ڈرائنگ روم کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا اسٹور اور کچن تھے' البتہ صحن عنقا تھا۔ چھت پر چاروں جانب پانچ فٹ اونچی دیواریں تھیں' لہٰذا چھت ہی کو صحن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

وہ دن انہوں نے گھر ہی میں گزارا تھا۔ شام سنگھ نے استعمال کی تمام چیزیں پہلے ہی بہم پہنچا دی تھیں۔ اگلی صبح بانو نے ناشتہ تیار کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ کچن میں داخل ہوئی تھی' لہٰذا اس کے احساسات عجیب سے تھے۔ ناشتے کے بعد چائے پیتے ہوئے وہ مستقبل کی منصوبہ بندی میں مشغول ہو گئے۔

چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بانو بولی۔ "ہم لوگ یہاں تک تو بحفاظت پہنچ گئے ہیں' مگر اب اس جیل سپرنٹنڈنٹ دیوی پرشاد ترپاٹھی کو کیسے ڈھونڈیں گے؟"

مراد نے حسب عادت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ترپاٹھی کا پتہ چلانا زیادہ مشکل کام نہیں ہو گا۔ ظاہر ہے وہ راجستھان کی کسی جیل میں اب بھی سپرنٹنڈنٹ کے طور پر کام کر رہا ہو گا' لیکن پہلے ہمیں گھوم پھر کر جے پور اور گردونواح میں مکمل آگاہی حاصل کرنی پڑے گی تاکہ کسی مشکل صورتِ حال میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکل کھڑے ہوئے۔

وہ سڑک پر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک سائیکل رکشہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ "پرنام شریمان جی! آئیں رکشے میں بیٹھیں۔ آپ کو اس گلابی نگری کی سیر کراؤں۔" مراد نے چند لمحے رکشہ ڈرائیور کا جائزہ لیا پھر بانو کو اس میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی کسرتی جسم کے مالک ادھیڑ عمر ڈرائیور نے رکشہ آگے بڑھا دیا۔

تھوڑا آگے جا کر وہ بولا۔ "مہاراج! کہاں چلوں؟"

مراد نے کہا۔ "یار! ہم تو یہاں اجنبی ہیں۔ جے پور کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ

تمہاری مرضی ہے کہ شروع کہاں سے کرتے ہو۔"

یہ سن کر ڈرائیور کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ "سرکار! میرا نام سیوا رام ہے اور دوسروں کی سیوا ہی میرا دھرم ہے۔ آپ بالکل چنتا نہ کریں۔ آپ کو یہاں کی بھرپور سیر کراؤں گا۔ میں ہوں تو سائیکل رکشہ کا ڈرائیور مگر جے پور کے بارے میں میری معلومات ٹورازم دبھاگ (محکمے) کے گائیڈوں سے زیادہ ہیں۔"

مراد اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان رکشے کی رفتار سے بھی تیز چل رہی تھی۔ "شریمان جی! آپ کو پتہ ہے کہ جے پور کو گلابی شہر کیوں کہا جاتا ہے؟"

مراد نے نفی میں سرہلا دیا تو سیوا رام فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔ "آج سے تقریباً نوے سال پہلے پورے شہر کو گلابی رنگ میں رنگا گیا تھا۔ ہر چھوٹی بڑی عمارت کو اس لئے یہ رنگ دیا گیا تھا کہ ان دنوں برطانوی ولی عہد ہندوستان کے دورے پر آیا تھا اور اسے جے پور بھی آنا تھا۔ راجہ نے ولی عہد بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوئی انوکھا کام کرنے کا سوچا' لہٰذا ہر چیز پر گلابی رنگ پھیر دیا گیا۔ ولی عہد یہاں آکر بڑا متاثر ہوا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "پنک سٹی آف انڈیا!" تبھی سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ برصغیر کے عظیم ترین صحرا کے ایک گوشے میں واقع اس شہر کو "گیٹ وے آف راجستھان" بھی کہا جاتا ہے۔"

سیوا رام رکشہ کھینچتے ہوئے باقاعدہ شاعری پر اتر آیا تھا۔ "یہ دھرتی راجپوت بہادروں کی سرزمین ہے۔ اس کی وجہ شہرت شاہی محل اور خوبصورت رنگوں سے مزین بازار ہی نہیں بلکہ اس کا اصل حسن آپ اب بھی چاروں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ وہ سامنے جاتیں سندر اور دراز قد مارواڑی عورتیں جن کی چولیوں اور گھاگھروں نے سورگ کا منظر زمین ہی پر پیدا کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور چاندی کے زیورات' سڑکوں پر چلتی اونٹ گاڑیاں ماضی اور حال کے حسن امتزاج کا شاہکار ہیں۔"

بانو اگرچہ خاموش بیٹھی تھی مگر اس کی باتوں میں کافی دلچسپی لے رہی تھی۔

"سیوارام جی! آپ تو بڑے دانشور قسم کے آدمی ہیں۔" اپنی تعریف سن کر سیوا رام نے سینہ پھیلا کر دوبارہ نثر میں شاعری شروع کر دی۔ "شری متی جی! ابھی تو میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ مجھے تو لوگ راجستھان کا انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں۔ بہرحال میں آپ کو جے پور کی بابت بتا رہا تھا۔ موجودہ شہر محض ۲۶۰ سال پرانا ہے۔ مہاراجہ جے سنگھ نے اسے اپنے نام پر بنایا تھا۔ وہ خود تو پہاڑی پر واقع امبر فورٹ میں رہتا تھا۔

"راجہ نے اپنے لئے جنتر منتر کی طلسماتی عمارت بنوائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ سامنے ہوا محل کی پرشکوہ عمارت ہے۔ ویسے بھی کبھی یہ باقاعدہ محل نہیں رہا۔ فقط ایک بار شاہی گھرانے کی خواتین نے یہاں کھڑے ہو کر کسی جلوس کا نظارہ کیا تھا اور اس کے ساتھ والی عمارت راجستھان کی صوبائی اسمبلی کی بلڈنگ ہے۔" مراد اس کی چرب زبانی سے کسی قدر اکتا کر بولا۔ "یار سیوارام! باقی معلومات پھر کبھی بتا دینا۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ فی الحال کہیں رک کر کھانا کھاتے ہیں۔"

انہوں نے دوپہر کا کھانا ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کھایا۔ اس دوران سیوا رام باہر کھڑا رہا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے کے لئے کہا بھی تھا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ "سرکار! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں۔ میں ہریجن ہوں۔ اگر ہوٹل والوں کو پتہ چل گیا کہ ایک اچھوت بھی ہوٹل کے اندر کھانا کھا رہا ہے تو میرے ساتھ آپ کی بھی شامت آجائے گی۔"

کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلے تو وہ پھر ان کی سیوا کے لئے حاضر تھا۔ انہیں لے کر ایک وسیع و عریض باغ میں واقع محل میں داخل ہوتے ہی اپنی قابلیت بگھارنے لگا۔ "شری متی جی! یہ سٹی پیلس ہے۔ یہ مغل اور راجستھانی طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے اندر موجود آرٹ گیلری میں چاندی کے برتنوں کا دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ جب بھی جے پور کے مہاراجہ برطانیہ وغیرہ کے سفر پر جاتے تھے تو ان کے لئے دریائے گنگا کا پانی یعنی گنگا جل انہی برتنوں میں بھر کر ان کے ساتھ لے جایا جاتا تھا۔"

مراد اور بانو آج کی سیر سے کافی لطف اندوز ہوئے تھے۔ ان کے تنے ہوئے اعصاب قدرے پرسکون ہو گئے تھے۔

اس کے بعد سیوا رام نے انہیں چاند پول گیٹ اتارا تو مراد نے اسے سو کا نوٹ تھمایا جسے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ "مہاراج! میں کل صبح پھر آؤں گا تاکہ گھومنے میں آپ کو کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" مراد نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے روانہ ہونے کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔"

اگلے چند روز بھی اسی طرح گزارے۔ شام کے کھانے کے بعد بانو بولی۔ "مراد! ہمیں یہاں آئے پندرہ روز ہو گئے ہیں، مگر ابھی تک ہم اصل مقصد کی جانب ایک انچ بھی نہیں بڑھے۔" مراد اس کی جانب دیکھتے ہوئے پرخیال لہجے میں بولا۔ "کہہ تو تم صحیح رہی ہو مگر یہاں حفاظت سے پہنچ کر محفوظ قیام کا بندوبست کر لینا بھی اہم کامیابی ہے اور ہم یہ بنیادی مرحلہ طے کر چکے ہیں۔ رہا آگے کا مسئلہ تو یقیناً اس میں بھی پیش رفت ہو گی۔ ویسے تمہارے خیال میں یہ سیوا رام کیسا آدمی ہے۔"

بانو بولی۔ "بظاہر تو خاصا بھلا آدمی ہے۔ چہرے مہرے سے بھی کافی معصومیت جھلکتی ہے۔ مگر اصل انسان تو چہروں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی کے بارے میں بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، ویسے تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟"

مراد کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے وہ ہمارے کام آ سکتا ہے۔ ہمیں ایک آدھ بھروسے کے آدمی کی ضرورت تو پڑے گی۔ بہرحال میں کل سیوا رام کے ذریعے ترپاٹھی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

سیوا رام کی کارکردگی پہلے ہی روز بری نہیں رہی تھی۔ اس نے آئی جی جیل خانہ جات کے کلرک سے دوستی گانٹھ لی تھی اور واپس آکر بتایا تھا کہ ترپاٹھی ڈیڑھ سال قبل ریٹائر ہو چکا ہے۔ اس نے یہ ریٹائرمنٹ قبل از وقت لے لی تھی۔ وہ رہنے والا تو بیکانیر کا ہے مگر ریٹائر ہونے کے بعد اس نے محکمے سے کوئی رابطہ نہیں رکھا اور وہ لاپتہ ہو گیا ہے۔

جس کی وجہ سے محکمہ اسے پنشن بھی نہیں دے رہا۔ چند ایک بار اس کے ایڈریس پر یاددہانی کے نوٹس بھجوائے گئے تھے مگر پتہ چلا کہ اس بنگلے کو وہ کافی عرصہ پہلے فروخت کر چکا ہے۔ لہٰذا کسی نے محکمانہ نوٹس وصول نہیں کیے۔

یہ اطلاع مراد کے لیے یقیناً حوصلہ افزا نہیں تھی، مگر وہ اتنی جلدی حوصلہ کیسے ہار بیٹھتے؟ اس لیے سیوا رام کو کچھ رقم دے کر شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔

۱۹۷۹ء میں پورے شمالی ہند میں گرمی کچھ معمول سے زیادہ ہی پڑی تھی۔ دیگر علاقوں کی طرح جے پور کے لوگ بھی آسمان کی جانب پرامید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا بارش کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ مگر بادلوں نے گویا نہ برسنے کی قسم کھائی تھی۔ حالانکہ عام حالات میں جے پور میں موسم گرما زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ دس اپریل سے ۲۰ مئی تک محض چالیس روز ہی گرمی کی شدت رہتی ہے۔ اس کے بعد بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اگست کے آخر تک جاری رہتا ہے۔

اتوار کی سہ پہر مراد اور بانو نے ایم آئی روڈ پر واقع چھوٹے سے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہی آسمان پر ہلکے سے بادل چھا گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان بادلوں سے یوں ڈھکا کہ دن پر رات کا گماں ہونے لگا۔ ہوا میں موجود نمی اس بات کا اظہار تھی کہ قریب ہی کہیں بارش ہو رہی ہے۔ موسم کے اس سہانے پن کا لطف لینے کے لیے اکثر لوگ چھتوں یا سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

وہ دونوں بھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چہل قدمی کی نیت سے ہوٹل سے نکلے اور باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ مراد نے گزشتہ چند ماہ سے داڑھی بڑھالی تھی تاکہ سرسری نظر میں کوئی شخص یہ اندازہ نہ کر سکے کہ چند ماہ پہلے وہ بھارتی جیلوں میں قید کاٹنے والا مراد ہے۔ اس شکل میں وہ کافی باوقار لگ رہا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ سے دونوں اکٹھے رہ رہے تھے۔ مگر ان کے درمیان باہمی احترام کے احساسات نے خود بخود نظر نہ آنے والی حدِ فاصل برقرار رکھی تھی اور دونوں ہی اسے قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس

وجہ سے بدگمانی کسی کے بھی ذہن میں جگہ نہ پاسکی تھی۔

اس وقت پیدل گھومنے سے مراد کا مقصد محض تفریح نہیں تھا بلکہ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ان کی نگرانی تو نہیں کی جارہی۔ کچھ دور جاکر وہ مطمئن سے لہجے میں بولا۔ "سنا تھا کہ جے پور میں بھارتی خفیہ اداروں نے نظر نہ آنے والا ایک جال سا بن رکھا ہے، مگر خدا کا شکر ہے ہم لوگ ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آئے۔" بانو دھیرے سے بولی۔ "مگر اس بات کا اندیشہ تو بہرحال موجود ہے۔ لہٰذا ہمیں کچھ تیز ہونا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ اڑنے سے پہلے ہی دھر لیے جائیں۔"

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ موسم اب بھی خوشگوار تھا۔ اچانک ہی ہلکی سی پھوار پڑنے لگی تھی۔ بانو بولی۔ "میرا خیال ہے کوئی سواری لے کر ہمیں واپس گھر چلنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ بارش میں گھر جائیں۔" مراد نے بھی قدرے تشویش سے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی اور رک کر ٹیکسی یا رکشہ ڈھونڈنے لگا۔ اسی دوران بارش کی تیز بوندیں گرنے لگیں مگر دور تک کوئی خالی سواری نظر نہیں آرہی تھی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ بولا۔ "ایسے تو ہم بالکل بھیگ جائیں گے۔ وہ سامنے غالباً کوئی ریسٹورنٹ ہے۔ آؤ فی الحال وہیں بیٹھ کر بارش سے بچیں۔" بانو کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ساتھ چلتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوگئی۔ یہ درمیانے درجے کا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ ہال کے آخری سرے پر چند فیملی کیبن بھی موجود تھے۔

وہ دونوں کچھ تیزی سے چلتے ہوئے کیبنوں کی جانب بڑھے۔ پہلے چھ کیبن تو خالی نہ تھے البتہ آخری سات نمبر کیبن میں انہیں جگہ میسر آگئی۔ بارش میں شدت آجانے کی وجہ سے بہت سے اور لوگ بھی ریسٹورنٹ میں داخل ہورہے تھے اور تھوڑی دیر میں ہال بھی تقریباً بھر گیا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر استقبالیے پر موجود لڑکی اور ویٹروں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عام حالات میں یہ ہوٹل گاہکوں کی زیادہ توجہ حاصل نہیں کرتا۔

ادھیڑ عمر کے ایک ویٹر نے آکر ان کی میز پر کپڑا پھیرا اور سر کو ہلکے سے خم دیتے ہوئے بولا۔ "مہاراج! آپ کیا پسند کریں گے؟" مراد نے استفہامیہ نظریں بانو کی جانب اٹھائیں تو وہ بولی۔ "فی الحال تو کافی لے آؤ۔ بعد میں دیکھیں گے کیا کھانا ہے۔" تھوڑی دیر بعد کافی سرو ہوگئی تھی۔ بظاہر عمارت جتنی صاف ستھری نظر آتی تھی برتن اس سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مگر انہیں اس سے کوئی خاص غرض نہ تھی۔

وہ دونوں کافی پیتے ہوئے ہال کے بیرونی شیشوں سے موسلا دھار بارش کو دیکھتے رہے۔ اس مقصد کے لیے مراد نے سامنے موجود پردے کو ایک طرف کھسکایا تھا۔ تھوڑی دیر میں موسلا دھار بارش کی وجہ سے سڑک کسی جھیل کا منظر پیش کررہی تھی۔

تبھی ہال کا بیرونی دروازہ تیزی سے کھلا اور اکہرے بدن کا ایک دبلا پتلا شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ استقبالیے کے قریب رک کر غالباً کسی میز کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ خالی نشست نہ پاکر وہ کیبنوں کی قطار کی جانب بڑھا اور پردے ہٹا کر ان کے اندر جھانکنے لگا۔ یہ حرکت مراد سمیت سبھی کو ناگوار گزری تھی۔

ابتدائی کیبنوں میں دو سے زیادہ افراد موجود پاکر نووارد کی نگاہوں میں مایوسی کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس دوران وہ کچھ خوفزدہ سی نظروں سے ہوٹل کے بیرونی دروازے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ مراد کے کیبن میں جلدی سے داخل ہوا اور "ایکسکیوزمی" کہتا ہوا مراد کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے مراد اور بانو نے بری طرح تاؤ کھایا تھا۔ ان دونوں کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کسی ردعمل کا اظہار کرتے ہوٹل کا بیرونی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ دوبارہ کھلا اور چار ہٹے کٹے افراد اندر داخل ہوئے۔ وہ شکل ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے متلاشی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا اور پھر غالباً اپنے مطلوبہ شخص کو نہ پاکر کیبنوں کی جانب بڑھے۔

اس دوران مراد کی نگاہیں بے ساختہ انداز میں اپنے ساتھ اجنبی نوجوان کی جانب

اٹھ گئیں جس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے سامنے موجود پردہ کھینچ کر برابر کر دیا تاکہ باہر سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے مگر اس حرکت پر جھنجھلا کر بانو نے پردہ دوبارہ ہٹا دیا تھا۔

چاروں غنڈے ہر کیبن کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکتے ہوئے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر موجود جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ آخری کیبن کے سامنے پہنچے تو ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ سب سے آگے والے پستہ قد نے کیبن کا پردہ پوری طرح ہٹا دیا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ان تینوں کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ جس کے ساتھ ہی مراد اور بانو کے چہروں کی رنگت اڑ گئی تھی' مگر پھر دونوں نے خود کو سنبھالا۔

مراد مضبوط لہجے میں بولا۔ "مسٹر! یہ کیا حرکت ہے۔ تمہیں علم نہیں کہ ہر بات کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔" یہ سن کر پستہ قد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ "واہ بھئی واہ! تو تم اب ہمیں آداب سکھاؤ گے۔ اسے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔" مراد حیران سا ہو کر بولا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ ہم نے آخر تمہاری کون سی چیز چرائی ہے؟"

پستہ قامت شخص اپنی خیالی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "ہمارے مجرم کو اپنے پاس چھپا رکھا ہے۔ اوپر سے پوچھتے ہو کیا چرایا ہے؟" مراد اچانک کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ "یہ تو میرا پرانا دوست ہے۔ یہ کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

یہ سن کر وہ ٹھگنے قد کا شیطان اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ "ارے بھئی شنکر اور شمبھو! سنا تم نے یہ شیطان جی بھی اس حرامی راجیو کے ساتھی ہیں۔ چلو اچھا ہے انہیں بھی اپنے ساتھ لئے چلتے ہیں۔" یہ صورتِ حال دیکھ کر بانو نے گڑبڑا کر مراد کی جانب دیکھا اور پھر پست قامت کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "مسٹر! میرے ساتھی غلط کہہ رہے

ہیں۔ دراصل ہمارا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ بدمعاش بانو کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "ارے دیوی جی! آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔ چنتا مت کریں' آپ تو دیوی ہیں اور ان کی صرف پوجا کی جاتی ہے۔ آپ کو کسی کشٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

مراد کے ساتھ بیٹھا شخص جسے پست قامت نے راجیو کے نام سے مخاطب کیا تھا' دھیمی سی آواز میں بولا۔ "بدری ناتھ! یہ عورت صحیح کہہ رہی ہے۔ واقعی میرا ان لوگوں سے کوئی سمبندھ (تعلق) نہیں۔ میں تو تم سے چھپنے کے لئے زبردستی یہاں آ بیٹھا تھا۔"

یہ سن کر بدری ناتھ نے ہلکا سے قہقہہ لگایا۔ "تم تینوں کے بیان ہی ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ لہٰذا سچ جھوٹ کا فیصلہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ تم تینوں کو "آشرم" چلنا پڑے گا۔" یہ سن کر راجیو نے قدرے جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ "یہ تم لوگوں کی خام خیالی ہے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں۔"

بدری ناتھ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے آگے بڑھا اور راجیو کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔ مراد اچانک اٹھا اور اس نے بدری کا ہاتھ پکڑ کر اسے بری طرح جھٹک دیا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ اگر تمہیں اس شخص کے خلاف کوئی شکایت ہے تو جا کر پولیس کو اطلاع دو۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے تم کون ہوتے ہو۔"

بدری اپنی توہین پر تاؤ کھاتے ہوئے بولا۔ "تم درمیان میں ٹانگ اڑا کر اپنے لئے مصیبت مول لے رہے ہو۔" پھر وہ اچانک بانو کی جانب مڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "شریمتی جی! اپنے پتی کو سمجھائیں کہ خواہ مخواہ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ یہ تو خیر مرے گا ہی اور آپ بھی ہمیشہ کے لئے ودوا (بیوہ) ہو جائیں گی۔"

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ اسے مراد پر غصہ آ رہا تھا۔ غصے پر قابو نہ پا سکی تو تیز آواز میں بولی۔ "یہ تم پرائے پھڈے میں کیوں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ بے موقع دلیری حماقت کا دوسرا نام ہے۔"

مراد اسی متانت سے بولا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں نے ساری عمر قانون کا پالن (عمل در آمد) کیا ہے۔ اس لئے اپنے سامنے ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا۔"

پھر وہ بدری ناتھ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں میرے بارے میں علم نہیں۔ سی بی آئی کے مقامی ایس پی رام سروپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میں خود "بھارت ٹائمز" کا بیورو چیف ہوں۔ میری ایک فون کال پر سارے جے پور کی پولیس ابھی یہاں پہنچ جائے گی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ اپنے انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔"

بانو اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ حیران تھی کہ یہ شخص کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بول رہا ہے مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی تھی۔ بدری ناتھ گومگو کا شکار ہو چکا تھا۔ کیونکہ یہ صورتِ حال اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے گھوم کر اپنے ساتھی شنکر اور شمبھو کی جانب مشورہ طلب انداز سے دیکھا۔

شنکر اس کا مطلب سمجھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "بدری ناتھ جی! میرے وچار میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوامی جی سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ رہا راجیو کا بچہ تو اس کی ساتھی تو ہمارے قبضے میں ہے ہی۔ اگر اس دو ٹکے کے صحافی نے کوئی چالاکی دکھائی تو اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

بدری ناتھ بھی اس کی رائے سے متفق نظر آتا تھا۔ ان چاروں نے قہر آلود نگاہیں مراد پر ڈالیں اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ ہال میں موجود اکثر افراد یہ تماشا دیکھ رہے تھے مگر کسی نے مداخلت کی ہمت نہیں کی۔ البتہ ان کے چلے جانے کے بعد سبھی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

راجیو ممنون نگاہیں مراد پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "شریمان جی! مجھے آپ کا نام تو معلوم نہیں مگر آپ نے اس وقت میری جو مدد کی ہے اس کے لئے جیون بھر احسان مند رہوں گا۔ ویسے اب بہتری اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے نکل چلیں اگر انہیں حقیقت حال کا

علم ہو گیا تو میرے ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں۔"

مراد کسی قدر تمکنت بھرے انداز میں بولا۔ "فکر مت کرو۔ ویسے حقیقت حال سے تمہاری کیا مراد ہے؟" راجیو کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"اصل میں مجھے سی بی آئی کے ایس پی رام سروپ کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ یقیناً آپ نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کا تعلق "بھارت ٹائمز" سے نہیں کیونکہ میں خود صحافی ہوں۔ لہٰذا جب انہیں غلطی کا احساس ہو گا تو فوراً لوٹ کر آئیں گے اور پھر........"

مراد اس کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ کم بخت کون تھے اور تمہارا ان سے کیا جھگڑا ہے؟"

راجیو بولا۔ "اپنے جھگڑے کی بات تو بعد میں بتاؤں گا۔ مگر یہ سبھی "پوتر پاپی" گروہ کے لوگ تھے۔" مراد کے ساتھ بانو بھی حیران سی رہ گئی تھی۔

"یار راجیو! یہ پوتر پاپی کس چڑیا کا نام ہے؟" اب راجیو کی آنکھوں میں شکوک کے سائے لہرانے لگے تھے۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا تعلق جے پور سے نہیں ورنہ یہاں کا تو بچہ بچہ اس نام سے واقف ہے۔"

ابھی مراد نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ بانو کی نظریں ہوٹل کے داخلی دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ آٹھ دس مسلح اور باوردی پولیس والے ایک انسپکٹر کی قیادت میں اندر داخل ہوئے تھے اور بغیر رکے خود ان ہی کی جانب بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مراد کے چہرے پر اچانک تشویش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

پولیس والوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مراد اور بانو چند لمحوں کے لئے بری طرح ڈگمگا گئے تھے۔ بانو ہراساں لہجے میں بولی۔ "دیکھ لیا خواہ مخواہ بہادری دکھانے کا نتیجہ۔"

مراد کے جواب دینے سے پہلے ہی پولیس افسر تیز چلتا ہوا ان کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ نسبتاً ٹھگنے سے قد کا بدصورت انسپکٹر کیبن کے دروازے میں کھڑا ہو کر ان کی جانب یوں

گھورنے لگا جیسے نگاہوں ہی سے ان کی نیت جان لینا چاہتا ہو۔

مراد نے خود کو سنبھالتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ "آفیسر! یہ کیا حرکت ہے۔ آپ بلاوجہ ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟" انسپکٹر اس کی خوداعتمادی سے کسی قدر مرعوب ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے آپ کی نجی گفتگو میں مداخلت کررہا ہوں مگر آپ سب کو تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

مراد اکھڑے لہجے میں بولا۔ "مگر کیوں؟ آخر ہم آپ کے ساتھ کیوں جائیں؟ ہم نے کونسا اپرادھ (گناہ) کیا ہے؟"

انسپکٹر بھی افسرانہ موڈ میں آگیا تھا۔ "یہ تو آپ کو وہیں جاکر پتہ چلے گا۔ ویسے ایک بات کا دھیان رکھیں۔ ہم آپ کی انکوائری کے لئے آئے ہیں۔ آپ نے الٹا ہم سے سوالات پوچھنا شروع کردیے ہیں۔ یہ بات آپ کو مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلیں' ورنہ ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔"

اس مرحلے پر بانو نے دخل اندازی کرتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔ "مگر آفیسر! ہمیں پتہ تو چلنا چاہئے کہ ہمیں کس جرم میں شامل تفتیش کیا جارہا ہے۔" انسپکٹر نے اس کی بات سے زیادہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"شری متی جی! تھوڑی دیر پہلے کسی گمنام شخص نے ہمیں فون پر اطلاع دی ہے کہ اس ہوٹل کے سات نمبر کیبن میں موجود "پوتر پاپی" گروہ کے تین افراد کسی جرم کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں' لٰہذا ہم اس سلسلے میں آپ سے کچھ پوچھ تاچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر بانو کے ذہن نے یک دم پلٹا کھایا اور وہ کسی فیصلے پر پہنچتی ہوئی اپنائیت بھرے انداز میں انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "معزز آفیسر! آپ اتنے ذہین اور تجربے کار افسر ہیں' یہ بتائیں کہ ہم لوگ چہروں سے پوتر لگتے ہیں یا پاپی؟"

انسپکٹر نے محبت آمیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کماری جی! سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل کہتا ہے کہ آپ تو سو فیصد پوتر ہیں' البتہ آپ کے یہ دونوں

ساتھی تو شکل ہی سے پاپی بلکہ پرانے پاپی لگتے ہیں۔"

بانو اپنی نشست سے اٹھی اور دل موہ لینے والے انداز سے انسپکٹر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "آفیسر! کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ محض ایک گمنام کال کی وجہ سے آپ ہماری توہین کرنا چاہتے ہیں۔"

انسپکٹر بڑبڑایا۔ "دیوی جی! آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں کیونکہ میں نے آج تک کسی ناری خصوصاً سندر ناری کا دل نہیں توڑا' حالانکہ سندر لڑکیوں کا سلوک بھی میرے ساتھ مثالی نہیں رہا۔"

بانو نے بھی آداب بجالانے والے انداز میں کہا۔ "مہاراج! آپ تو اس کلجگ کے کرشن بھگوان ہیں۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دیں۔ کسی روز آپ کی یہ داسی سیوا کے لئے حاضر ہوگی۔" انسپکٹر مہاراج کچھ دیر اس کی جانب یوں دیکھتا رہا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ سچ بول رہی ہے یا اس پر طنز کررہی ہے۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالا اور بانو کو تھما دیا۔ پھر سپاہیوں کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "چلو واپس اور آئندہ سے فون پر آبزرویشن لگا کر رکھنا تاکہ کوئی بدمعاش غلط اطلاع دینے کے بعد بچ کر نہ جاسکے۔" یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

ان کو باہر جاتے دیکھ کر مراد کی جان میں جان آئی اور اس نے قدرے حیرت سے کہا۔ "اس وقت تم نے کمال ہی کردیا۔" بانو سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "میرے کمال سے زیادہ اس پولیس والے کے حد سے بڑھے ہوئے گھامڑپن کا دخل ہے' بہرحال اب جلد یہاں سے کھسکنے کی تیاری کرو۔ ضروری نہیں دوبارہ بھی ایسا گدھا پولیس افسر آئے۔"

بل ادا کرنے کے بعد وہ تینوں باہر نکلے اور کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد جب مطمئن ہوگئے کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جارہا تو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چاند پول گیٹ کے باہر اپنے مکان پر پہنچے۔ اس واقعے نے سبھی کے اعصاب متاثر کئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھا کر بانو چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی کمرے میں خاصی دیر خاموشی طاری رہی۔ مراد نے راجیو کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ”مسٹر راجیو! اب ذرا تفصیل سے بتائیں کہ آپ کا ان لوگوں سے کیا جھگڑا ہے اور یہ لوگ تھے کون؟“

راجیو کچھ دیر ذہن میں الفاظ ترتیب دینے کے بعد آہستگی سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کو یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں مقامی اخبار ”راجستھان پتریکا“ میں کرائم رپورٹر کے طور پر کام کررہا ہوں اور ان کا تعلق ”پوتر پاپی آف پنک ٹی“ نامی گروہ سے ہے۔ یہ گروہ گذشتہ ڈیڑھ دو سال سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کا ذکر پچھلے کچھ عرصے سے اخبارات اور جرائم کے حلقوں میں تسلسل کے ساتھ آرہا ہے۔ رائے عامہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک بڑا حلقہ اس کا مداح ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جے پور کو گلابی نگری کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس گروہ نے اپنا نام رکھا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”یہ گروہ کس کی قیادت میں کام کررہا ہے؟ اور اتنے کم عرصے میں کیسے اس قدر منظم ہوگیا ہے؟“ راجیو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس گروہ کے مقاصد بظاہر بہت نیک ہیں۔ اس کی تشکیل کا کریڈٹ راجستھان جیل سروس کے ایک سینئر افسر دیوی پرشاد ترپاٹھی کو جاتا ہے جس نے دو سال پہلے اپنی ملازمت سے قبل از وقت رضاکارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔“

ترپاٹھی کا نام سن کر مراد بری طرح چونکا‘ مگر اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔

راجیو کہہ رہا تھا۔ ”جیل کی طویل ملازمت کے دوران مسٹر ترپاٹھی کا واسطہ ہر قسم کے جرائم پیشہ افراد سے رہا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی سروس کے آخری ایام کے دوران ہی اس گروہ کو منظم کرنا شروع کردیا اور جب یہ گروہ باقاعدہ شکل میں منظم ہوگیا تو اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر اس کی قیادت خود سنبھال لی۔“

مراد کے ذہن میں روشنی کے بہت سے جھماکے ہونے لگے کیونکہ اسے اپنے شکار کی بابت کچھ ابتدائی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ اسی دوران بانو چائے بنا کر لے آئی اور

ان کے سامنے برتن رکھ کر خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگی۔ مراد قدرے پُرجوش انداز میں پوچھنے لگا۔ ”اس گروہ کے مقاصد اور طریقہ واردات کیا ہے؟“

راجیو نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ظاہری طور پر یہ تنظیم سماجی برائیوں کے خاتمے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ دیگر ملکوں کی طرح بھارت میں بھی قانونی سقم کی وجہ سے بہت سارے مجرم قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں‘ لہٰذا یہ گروہ یعنی پوتر پاپی ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے عزم کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اب جب کوئی قاتل کسی ماتحت عدالت اور سپریم کورٹ سے باعزت بری کردیا جاتا ہے تو چند روز بعد اس کی لاش کسی فٹ پاتھ یا اس کی خواب گاہ میں پائی جاتی ہے جس کے ساتھ پوتر پاپیوں کا مخصوص کارڈ بھی موجود ہوتا ہے۔ بدنام زمانہ راشی افسروں کا بھی اکثر یہی حشر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جو لڑکے والے‘ غریب لڑکیوں کے والدین سے جہیز کا مطالبہ کرتے ہیں یہ تنظیم ان لڑکوں اور ان کے والدین کو مختلف حربوں سے اس قدر مجبور کردیتی ہے کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آجاتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں کی حوصلہ شکنی کے لئے بھی یہ لوگ انتہائی اقدام اٹھالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک یہ پوتر پاپی دہشت کے بجائے رحمت کی علامت بن گئے ہیں‘ البتہ معاشرے کے بااثر طبقات ان کے نام سے بھی نفرت کرتے ہیں۔“

یہ سن کر مراد اور بانو کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بانو قدرے پُرجوش انداز میں بولی۔ ”یہ مقاصد تو بہت اچھے ہیں‘ اگر کوئی فرد یا گروہ واقعی یہ کام کررہا ہے تو وہ سراہے جانے کے قابل ہے۔“

راجیو چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے معذرت کرکے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا تو مراد نے کہا۔ ”بانو بی بی! تم جس گروہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملارہی ہو جانتی ہو اس کا سربراہ کون ہے؟“ بانو نے نفی میں سرہلادیا۔ مراد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”اس کا قائد تمہارے بھائی اور دوسرے

بہت سے پاکستانیوں کا قاتل جیل سپرنٹنڈنٹ ترپاٹھی ہے جسے کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہش لئے ہم لوگ بھارت آئے ہیں۔" یہ سن کر چند لمحوں کے لئے بانو گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد راجیو واپس آکر بات چیت میں شامل ہوگیا۔ وہ مراد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو اپنا تعارف بھی کرادیں۔" مراد خوش دلی سے گویا ہوا۔ "میرا نام ارجن شرما ہے اور یہ شانتی ٹھاکر ہیں۔ ہمارا تعلق دہلی کے ایک غیر سرکاری ادارے "In Search of Peace" سے ہے جو اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں یونیسف اور یونیسکو کے تعاون سے مختلف سروے کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دونوں راجستھان آئے ہیں۔"

وہ تینوں بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ بانو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس گروہ کے لوگ آپ کے مخالف کیوں ہوگئے ہیں۔ بظاہر تو آپ ظالم نظر آتے ہیں نہ ذخیرہ اندوز!" راجیو یک دم بے حد سنجیدہ ہوگیا۔ "مس شانتی ٹھاکر! یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر زیادہ الجھی ہوئی نہیں۔ جب میں نے راجستھان یونیورسٹی سے جرنلزم کی ڈگری حاصل کی تو وہیں آشا نامی لڑکی بھی میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے' جس کے باعث ہمارے تعلقات خاصے خوشگوار ہوگئے جو عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی قائم رہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے "راجستھان پتریکا" جوائن کرلیا جبکہ آشا نے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر مختلف جرائد اور اخبارات کے لئے لکھنا شروع کردیا۔

"چھ ماہ قبل اس کے تاجر باپ کو اس گروہ نے اس کی دکان ہی میں چھت والے پنکھے سے لٹکا کر پھانسی دے دی اور لاش کے قریب پڑے ہوئے رقعے میں اس پر ناجائز منافع خوری اور زندگی بچانے والی جعلی ادویات کی فروخت کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ آشا اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی ماں تو بچپن ہی میں فوت ہوگئی تھی۔ باپ نے

اسے ماں کا بھی پیار دیا تھا۔ اس کا باپ بڑا ہی شریف انسان تھا اور جان بوجھ کر کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوسکتا تھا۔ آشا کا کہنا یہ ہے کہ اس سانحے کی تہہ میں ایک دوسری قسم کی سازش کار فرما ہے۔ وہ ہریجن خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے بھارتی معاشرے میں اس کے باپ نے اپنی محنت کی بدولت نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ مارکیٹ میں موجود بڑے بڑے جغادری ناموں والے تاجر اس سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے "پوتر پاپی" گروہ کے اشتراک سے اس بے گناہ کو قتل کرا دیا۔ قتل سے پہلے اس کے بوڑھے باپ رام دیال کو گمنام کالوں کے ذریعے دھمکی دی گئی تھی کہ وہ چند روز میں اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ اس کی جوان بیٹی کو اٹھالیا جائے گا اور خود اس کا برا حشر ہوگا۔

"بوڑھے رام دیال نے ان دھمکیوں پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور آخر کار وہ مارا گیا۔ اس خوفناک سانحے کے بعد آشا نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کا کھوج لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچائے۔ اس ضمن میں اس نے مجھ سے بھی تعاون کے لئے کہا ہے۔ ہم دونوں پہلے ہی سے انوسٹی گیٹو رپورٹنگ پر یقین رکھتے تھے' چنانچہ ہم نے اس گروہ کے خلاف کام شروع کردیا جس کے دوران کئی انکشافات ہوئے۔ ہم جے پور میں ان کے ہیڈکوارٹر میں چلے گئے۔ آشا نے تو اس میں باقاعدہ شمولیت بھی اختیار کرلی تھی' مگر کچھ ابتدائی کامیابیوں کے بعد ہم گروہ کی نظروں میں آگئے اور دھر لئے گئے۔ میں تو جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا مگر وہ بے چاری جانے کس حال میں ہوگی۔" دکھ بھرے واقعات سن کر وہ دونوں مزید دکھی ہوگئے۔ رات بہت بیت چکی تھی' لہٰذا تینوں سونے کے لئے چلے گئے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر راجیو نے جانے کا ارادہ کیا تو مراد نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "راجیو! تمہارا گھر یقیناً ان لوگوں کی نظر میں ہوگا' تمہارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" راجیو مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارجن جی! آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ آپ نے

کل جو میری مدد کی تھی' اس کے لئے جیون بھر احسان مند رہوں گا اور ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اپنی بساط کے مطابق آپ کے کام آنے کی بھی کوشش کروں۔ ویسے آپ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ میں اتنا بھی تر نوالہ نہیں۔ پہلی بار تو میں اپنی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کے سبب ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا' ورنہ میرے اپنے ذرائع بھی کچھ کم نہیں۔"

بانو اس کی بات سن کر زیر لب مسکرا دی اور آہستہ سے بولی۔ "راجیو جی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ دوبارہ بھی اپنی اسی خوداعتمادی کے سبب ان لوگوں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔" راجیو سپاٹ لہجے میں کہنے لگا۔ "نہیں شانتی جی' ایسا نہیں ہوگا۔ ویسے آپ لوگوں کی تسلی کے لئے بتادوں کہ میں واپس اپنے گھر نہیں جا رہا' بلکہ گاندھی نگر میں ایک محفوظ ٹھکانے پر جا رہا ہوں۔ جس کی بابت مجھے اور آشا کے سوا کسی کو علم نہیں اور مجھے وشواش ہے کہ وہ جان تو دے سکتی ہے مگر اس بارے میں انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔ ویسے مجھے صرف اس کی چنتا لگی ہے۔ اس کے لئے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ بھلے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

راجیو کے جانے کے بعد وہ خاصی دیر اسی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران کال بیل بجنے لگی۔ مراد نے دروازہ کھولا تو راجیو کو سامنے کھڑے دیکھ کر اسے حیرانگی ہوئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ ملنے چلا آئے گا۔ اس پر مستزاد اس کے ساتھ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکی بھی تھی جو اندر داخل ہوگئی تھی۔ وہ خاصی خوش شکل تھی مگر کسی قدر سہمی سی لگ رہی تھی جس کی وجہ سے خوبصورتی کچھ ماند سی پڑ گئی تھی۔

راجیو نے مسکراتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ "رات میں نے اپنی ساتھی آشا کا ذکر کیا تھا جو پاپیوں کے قبضے میں رہ گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں اپنے گاندھی نگر والے مکان میں پہنچا تو یہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی

بڑی خوشی وہاں میری منتظر ہوگی۔"

بانو نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو واقعی خوشی کا مقام ہے' مگر یہ وہاں سے رہا کیسے ہوئی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے مجھے یہ سب کچھ۔" راجیو کے جواب دینے سے پہلے آشا نے دھیمے سُروں میں کہنا شروع کیا۔ "انہوں نے ہم دونوں کو تلک نگر میں ایک مکان میں قید کر رکھا تھا جسے وہ اپنے ذیلی اڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہماری نگرانی کے لئے وہاں کل چھ افراد تھے۔ جب اچانک راجیو بھاگ نکلا تو پانچ آدمی اس کی تلاش میں روانہ ہوگئے اور مجھ پر نظر رکھنے کے لئے صرف گیان چند باقی رہ گیا۔ اسے جب مکمل تنہائی میسر آئی تو اس کی نیت خراب ہونے لگی۔ صورتِ حال کی مناسبت سے میں نے بھی اس کی کسی قدر حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ بے تکلف ہوگیا۔

"اس دوران میں نے اسے چائے پلانے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ گدھا فوراً کچن میں گھس کر چائے تیار کرنے لگا۔ میں نے فوراً کچن کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور بھگوان کا نام لے کر بھاگ کھڑی ہوئی اور سیدھی گاندھی نگر پہنچی اور شب وہیں بسر کی۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں راجیو بھی پہنچ گیا اور اب آپ لوگوں کے سامنے موجود ہوں۔"

بانو نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "آشا! آپ یہ بتائیں ان کے درمیان پہنچ کر آپ نے کچھ ٹھوس معلومات حاصل کیں یا اڑنے سے پہلے ہی دھرلی گئیں۔"

آشا کچھ دیر بانو کی آنکھوں میں جھانکتی رہی جیسے وہ کسی تذبذب کا شکار ہو' پھر دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ "میں ساری بات آپ کو ذرا تفصیل سے بتاتی ہوں۔ آپ خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں۔ راجیو آپ کو یہ تو بتا ہی چکا ہے کہ کس طرح اس گروہ نے میرے پتا کا ناحق خون کیا۔

"پتا کے قتل کے بعد میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ قاتلوں کا کھوج لگا کر رہوں گی۔ میں اس گروہ کے مقامی ہیڈ کوارٹر میں ایک مظلوم لڑکی بن کر پہنچی اور میں نے اپنے بارے

میں ایک فرضی کہانی سنائی۔ اپنے پتا اور اپنے بارے میں اصلیت کا بالکل اظہار نہیں کیا۔ خاصی پس و پیش کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنے کی ہامی بھرلی۔ اس سلسلے میں مجھے کئی روز تک باقاعدگی سے وہاں جانا پڑا۔

"شروع میں کچھ ہفتے چند پنڈت نما اشخاص بھاشن دیتے رہے جو مختلف پند و نصائح پر مشتمل تھے۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے سبق مختلف کیسٹوں اور استادوں کے ذریعے دیئے جاتے رہے۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ اس دوران وہاں کسی ایک شخص نے بھی مجھے بری نگاہ سے نہیں دیکھا اور میں اس گروہ سے ذہنی طور پر متاثر ہونے لگی تھی۔

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میری تربیت کا صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کی تکمیل کے بعد مجھے باقاعدہ طور پر گروہ کے معزز ارکان میں شامل کرلیا جائے گا اور شانتی جی! آپ جانتی ہیں وہ مرحلہ کیا تھا؟"

آشا کا لہجہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔ مراد اور بانو تجسس بھرے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی استفہامیہ نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد آشا نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اس مرحلے پر مجھے آدرش دیا گیا کہ میں "پوتر اشنان" (مقدس غسل) کرلوں تاکہ اس سے پہلے کے جیون میں کئے گئے میرے تمام گناہ دھل جائیں اور میں تمام دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جاؤں۔"

"یہ پوتر اشنان بظاہر عام غسل ہی تھا' مگر یہ ہیڈ کوارٹر کے ایک خاص باتھ روم میں ہوتا ہے۔ اسے باتھ روم کہنا تو مناسب نہیں کیونکہ وہ تو پورا شیش محل تھا جس کے در و دیوار اور چھت جدید قسم کے آئینوں سے آراستہ تھے۔ پاپی گروہ کی ایک ادھیڑ عمر سادھو خاتون نے پہلے اشنان کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کیا۔ میں نے پوتر اشنان کرلیا۔ تب تک مجھے کوئی قابلِ اعتراض پہلو نظر نہیں آیا' مگر اگلے ہی روز مجھے اس گروہ کے شیطانی ہتھکنڈوں سے آگاہی حاصل ہوگئی۔ جب گروہ کے خواتین ونگ کی نائب سربراہ نے اپنے کمرے میں مجھے وہ فلم دکھائی جو پوتر اشنان کے دوران وہاں پوشیدہ حساس کیمروں کے

ذریعے تیار کی گئی تھی۔ اس بڑھی حرافہ نے مجھے دھمکی آمیز لہجے میں نصیحت کی کہ اس پوتر اشنان کے بعد واپسی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی فرد گروہ کے کسی حکم سے سرتابی کی جرأت کرتا ہے' تو انتہائی ماہر فوٹوگرافر اس فلم میں تراجیم اور اضافے کردیتے ہیں جس کے بعد یہ فلم مذکورہ فرد کے حلقہء احباب میں تقسیم کردی جاتی ہے۔ دھمکی سننے کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ میں اس شیطانی گروہ کی سرگرمیاں منظرعام پر لاؤں گی۔ گروہ کے حکام کو جانے کیسے مجھ پر شک ہوگیا اور مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار ہونے کے بعد پتہ چلا کہ راجیو بھی ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔"

آشا اپنی طویل رام کہانی سنانے کے بعد خاموش ہوگئی۔ مراد کی زبان پر ایک سوال آگیا۔ "آشا جی! اس تمام عرصے میں آپ کی ملاقات گروہ کے قائد ترپاٹھی سے ہوئی؟"

آشا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا محض ذکر ہی سنا ہے۔ ویسے بھی وہ چند سینئر ترین پاپیوں کے سوا کسی سے نہیں ملتا۔" بانو راجیو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "آپ اپنے اخبار میں یہ سب کچھ کیوں نہیں چھاپ دیتے۔" راجیو اس کی سادہ لوحی پر مسکراتے ہوئے بولا۔ "شانتی جی! یہ مسئلہ اتنا سادہ ہوتا تو میں کب کا عمل کرچکا ہوتا۔ اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر سے میں نے بات بھی کی تھی مگر یہ سن کر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "تمہیں پتہ ہے یہ گروہ بڑے سے بڑے آدمی کے خلاف انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے نہیں ہچکچاتا۔ اس کے علاوہ عوام میں وہ انتہائی مقبول ہیں اور عام آدمی کے نزدیک پوتر پاپی دیوتا سمان ہیں۔"

مراد پوری بحث سے بے نیاز جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد راجیو اس کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "ارجن بھیا! آپ کہاں گم ہیں؟" مراد چونکتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری باتیں سن رہا ہوں اور اسی بات پر غور کررہا ہوں کہ ان کے مقامی آشرم میں داخل ہونے کے کیا امکانات ہیں؟"

راجیو نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "ان کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہونا سہل

نہیں۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو ترپاٹھی یا کسی دوسرے سینئر شخص تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ آشا اور میں تو مین گیٹ پر ہی شناخت کر لئے جائیں گے لہٰذا........"

وہ بات کو ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بانو ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ "راجیو بابو! آپ چنتا نہ کریں۔ میں ان کے اڈے میں داخل ہو کر ترپاٹھی تک رسائی حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔"

آشا دھیرے سے کہنے لگی۔ "شانتی دیدی! میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ وہ لوگ اچھے نہیں۔"

مگر بانو نے مراد کی جانب دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ ایسے ہی گھبرا رہے ہیں۔ ارے بھئی اب میں ایسی کانچ کی گڑیا بھی نہیں کہ یہ کام نہ کر سکوں۔ ویسے بھی اگر کوئی مشکل محسوس ہوئی تو آپ لوگوں کو اطلاع کر دوں گی' ورنہ وہاں سے واپس چلی آؤں گی۔ بہرحال یہ بعد کی باتیں ہیں' پہلے مجھے باہر ہی سے وہ آشرم تو دکھا دو۔"

مراد اور راجیو بڑی دیر تک اسے سمجھاتے رہے مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئی اور یہی فیصلہ ہوا کہ اگلے روز اسے پوتر پاپی گروہ کا مقامی ہیڈ کوارٹر دکھا دیا جائے گا جس کے بعد آئندہ کی حکمت عملی طے کی جائے گی۔

اگلے روز ناشتے کے بعد بانو سیوا رام کے سائیکل رکشہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی پہاڑی قلعے "امبر فورٹ" کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہ پہاڑی قلعہ جے پور سے گیارہ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے بانو دوسرے کئی رکشہ ڈرائیوروں کو قدرے حیرانی سے دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے تین تین سواریاں لدی تھیں اور وہ انہیں کھینچ کر پہاڑی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ وہ بے ساختہ سیوا رام کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "سیوا رام! تم اور یہ دوسرے لوگ محض اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کس قدر تکلیف دہ کام کر رہے ہو۔ تم کوئی دوسرا دھندا کیوں نہیں کر لیتے جس میں تمہاری عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔ اس ترقی یافتہ دور میں ایک انسان دوسرے انسانوں کے لئے

بار برداری کے جانور کی طرح کام کرے' یہ تو سراسر انسانیت کی تذلیل ہے۔ کیا تمہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوا؟"

سیوا رام نے سائیکل چلاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "شری متی جی! آپ کا مشورہ ٹھیک ہے' مگر مجھے اس دھندے کے علاوہ کوئی ایسا کام بتائیں جس میں محنت کش کی تذلیل نہ کی جاتی ہو۔ گاڑیاں صحیح کرنے والے مکینک جب گاڑیوں کے نیچے لیٹے انہیں ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں تو کیا انسانیت کی تذلیل نہیں ہوتی؟ شاندار کاروں کے اندر بیٹھے مالکان جب جاتے ہوئے ان مزدوروں کی طرف اجرت کے پیسے یوں اچھالتے ہیں جیسے بھیک دے رہے ہوں تو کیا وہ انسانیت کے احترام کے تقاضوں کے عین مطابق ہے؟ کماری جی! یہ سب وہ الفاظ ہیں جو کتابوں ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ ان باتوں کو رہنے ہی دیں تو زیادہ اچھا ہے۔" سیوا رام کے لہجے میں تلخی کا عنصر غالب تھا۔

بانو بھی چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ اعصاب کو بوجھل کر دینے والی یہ خاموشی کچھ دیر چھائی رہی تبھی سیوا رام اپنا سر جھٹکتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔ "ہاں تو شری متی جی! وہ سامنے جو قلعہ نظر آ رہا ہے' یہ چھ سو سال تک ریاست کی راجدھانی رہا ہے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر اس کی راہداریاں جس خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں' وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ شیش محل دیکھیں گی جس کے در و دیوار آئینوں سے آراستہ ہیں جہاں موم بتی کا چھوٹا سا شعلہ ان طلسمی آئینوں کی بدولت لمحے بھر میں ہزاروں متحرک روشنیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ صدیوں پہلے بھی ایسے ماہر کاری گر موجود تھے جنہوں نے پہاڑی ٹیلوں کو جادو نگری میں تبدیل کر دیا تھا۔"

امبر فورٹ دیکھنا تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل مقصد تو اس سے تھوڑی دوری پر واقع ویران سا قلعہ تھا جو کبھی کسی راجہ کا مسکن رہا تھا۔ اس کے سامنے سے گزرتے

ہوئے تو شکستہ کھنڈرات ہی نظر آئے تھے جہاں چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، مگر آشا اور راجیو کے بقول یہی پرانی سی عمارت پوتر پاپیوں کا مقامی ہیڈ کوارٹر تھا۔ سامنے سے گزرتے وقت بانو نے اسے بغور دیکھا، مگر دروازے پر مسلح گارڈز کے سوا اسے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔

وہاں سے واپسی کے سفر میں سیوا رام اسے جے پور کے تمام بڑے ہوٹلوں کے باہر گھماتا رہا، کیونکہ اس نے اپنے ذہن میں جو حکمت عملی طے کی تھی، اس کے مطابق اسے ان ہی میں سے کسی ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ سیوا رام جے پور کے سبھی اچھے ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ماہر گائیڈ کے مانند اپنی معلومات کا ذخیرہ اس کی جانب منتقل کر رہا تھا۔ "یہ سامنے والا ہوٹل رام باغ پیلس ہے اور وہ سوائی مان سنگھ ہوٹل ہے۔ اس سے کچھ دوری پر جے محل پیلس ہوٹل ہے۔"

اس طرح وہ اسے لے کر جے پور اشوکا اور کلارک آمیر کے سامنے سے گزرا۔ بانو کو سیر و تفریح سے کوئی خاص دلچسپی تو نہیں تھی، مگر ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ زمانہ بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ ان ہوٹلوں میں سے اکثر وہ محل تھے جنہیں راجوں مہاراجوں نے اپنی رہائش کے لئے بنوایا تھا۔ اس وقت ان کے اوپر سے پرندے بھی سہمے ہوئے گزرتے تھے کیونکہ حرم سراؤں میں نازک اندام راجکماریاں موجود ہوتی تھیں، مگر آج ان محل سراؤں میں محض چند سو روپے ادا کر کے کوئی بھی ایرا غیرا قیام کر سکتا تھا۔

بانو اس قسم کے خیالوں میں کھوئی تھی کہ سیوا رام کی آواز سے اپنی دنیا سے باہر لے آئی۔ "شری متی جی! ہم واپس گھر آ گئے ہیں۔" رکشے سے اتر کر وہ آئندہ کی حکمت عملی پر غور کرنے لگی اور سہ پہر کی چائے پر مراد سے مشورے کے بعد ہوٹل جے محل کی طرف چل پڑی۔ مراد نے بہت کہا کہ وہ پروگرام اگلے روز کے لئے ملتوی کر دے مگر وہ اپنا ہدف جلد از جلد حاصل کر لینا چاہتی تھی۔

ہوٹل جے محل مغل اور راجستھانی طرز تعمیر کے امتزاج کا عمدہ شاہکار تھا۔ استقبالیے پر خوبصورت سی ادھیڑ عمر خاتون نے اسے خوش آمدید کہا۔ ایک رجسٹر میں اس کا نام پتہ درج کرنے کے بعد اس نے روم سروس بوائے کو بلا کر چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم کو روم نمبر ساٹھ میں پہنچا دو۔"

بانو اپنا پرس گھماتی ہوئی پُراعتماد قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا اٹیچی کیس روم سروس بوائے نے پہلے ہی اوپر پہنچا دیا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے طائرانہ نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ انتہائی نفاست سے ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔

روم سروس بوائے ابھی تک مؤدب کھڑا تھا۔ "میڈم کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں۔" بانو نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ نمسکار کر کے باہر نکل گیا۔

رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ اس نے کمرے ہی میں کیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ پیدل ہی ہوٹل سے باہر نکل گئی۔ حسب پروگرام سیوا رام پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ وہ امبر فورٹ کی جانب روانہ ہو گئی۔ اتوار ہونے کی وجہ سے امبر فورٹ روڈ پر بہت ٹریفک تھی۔ تقریباً ساڑھے دس بجے وہ امبر فورٹ پہنچ گئے۔

سیوا رام نے پوچھا۔ "شری متی جی! کیا آج فورٹ کے اندر چلیں گی یا باہر ہی رکنا ہے۔" بانو نے کہا۔ "یہاں سے چائے پی کر آگے بڑھتے ہیں۔" وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ساتھ والے ویران قلعے میں زندگی کے کچھ آثار ہیں بھی یا نہیں۔ قلعہ نسبتاً نچلی جگہ پر تھا اس لئے وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ آدھ گھنٹے میں کوئی شخص اس عمارت سے باہر نکلتا دکھائی دیا اور نہ کوئی اندر داخل ہوا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے سیوا رام سے بولی۔ "چلو بھئی سیوا رام! مجھے وہ سامنے والے قلعے کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد وہیں گیٹ پر میرا انتظار کرنا مجھے کچھ دیر ہو جائے تو واپس مت جانا۔"

سیوا رام سائیکل چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "شانتی جی! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ میں بھلا واپس کیوں جانے لگا۔ اپنا تو کام ہی سیوا کرنا ہے۔ میں شام تک یہاں سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوں گا۔ آپ چنتا نہ کریں۔ اگر آپ شام تک واپس نہ آئیں تو جاکر ارجن شرما جی کو آپ کے بارے میں اطلاع بھی کردوں گا۔"

بانو رکشہ سے اتر کر گیٹ کی جانب بڑھی۔ دروازے پر مسلح گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ وہ پُراعتماد قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب جا پہنچی۔ گیٹ بدستور بند تھا۔ گرے رنگ کی یونیفارم میں ملبوس دونوں گارڈز اس کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔

ادھیڑ عمر گارڈ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے بولا۔ "نمستے میڈم! میں یہ پوچھنے کی گستاخی کرسکتا ہوں کہ آپ کو کسے ملنا ہے؟" اس کا لہجہ بھی الفاظ کے مانند شائستہ تھا۔ بانو بے نیازی سے کندھے اچکاتی ہوئی بولی۔ "کسی بھی ذمے دار آدمی سے ملا دو۔" گارڈ نے اس کی بات دھیان سے سنتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا انتظار کیجئے میں ابھی اندر بات کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گیٹ سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کیبن میں داخل ہوگیا اور انٹرکام پر کسی سے بات کرنے لگا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ باہر تک آرہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "گپتا جی! ایک ناری گیٹ پر کھڑی اندر آنے پر بضد ہے۔" جواب میں دوسری جانب سے پتہ نہیں کیا کہا گیا کہ گارڈ نے دوبارہ کہا۔ "مہاراج! اس کا اصرار ہے کہ وہ کسی ذمے دار شخص سے ملنا چاہتی ہے۔ جی ہاں! شکل و صورت کی بری نہیں بلکہ خاصی اچھی ہے اور خاصی پڑھی لکھی بھی لگتی ہے ٹھیک ہے میں اسے اندر بھجوا دیتا ہوں۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ گارڈ اس کی جانب بڑھا۔ "آئیں شری متی جی! مسٹر گپتا آپ کے منتظر ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گیٹ کا بغلی دروازہ کھول دیا۔ بانو کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چل پڑی۔ گیٹ سے تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک تنگ سے کاریڈور میں داخل ہوئے جس کے دونوں جانب کمروں کی قطاریں تھیں۔ بانو کو محسوس ہوا عمارت

باہر سے جتنی خستہ حال نظر آتی ہے اندر سے اتنی بری نہیں۔

تقریباً پچاس فٹ آگے جاکر گارڈ داہنی جانب مڑا اور پہلے دروازے کے باہر ہلکی سی دستک دی۔ پھر مڑ کر بانو کو پیچھے آنے کا اشارہ کرکے اندر داخل ہوگیا۔ یہ کمرہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے ایک پنڈت نما شخص نے موٹے شیشوں کی عینک سے بغور دونوں کی جانب دیکھا۔ پھر وہ گارڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے رجنی کانت! تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔" رجنی کانت مؤدب انداز میں سر کو ہلکے سے خم دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

میز کے سامنے پڑی خالی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ شخص بولا۔ "بیٹھیں کماری جی! مجھے گپتا کہتے ہیں۔ جگن کمار گپتا۔" بانو تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحے دونوں جانب خاموشی رہی۔ گپتا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ بانو خود کو کچھ نروس سا محسوس کر رہی تھی' مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

گپتا کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا' مگر پھر خود ہی بات شروع کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "جی دیوی جی! بتائیں آپ نے یہاں آنے کا کشٹ کیسے کیا اور میں آپ کی کیا سیوا کرسکتا ہوں۔"

بانو اب گھبراہٹ پر بڑی حد تک قابو پاچکی تھی' پھر بھی اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "شریمان گپتا جی! میرا نام شانتی ہے' شانتی ٹھاکر۔ اور میرا تعلق دہلی سے ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

گپتا مہاراج اس کے سراپا پر نظریں جماتے ہوئے گویا ہوئے۔ "آپ گھبرائیں نہیں' جو بات بھی کرنی ہے کھل کر کہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

بانو میز پر ایک کہنی ٹکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ "اصل میں ایک سمیا (مسئلہ)

لے کر حاصل ہوئی ہوں۔ میرے ساتھ ایک شخص نے بہت ظلم کیا ہے۔ میں نے سنا ہے آپ کی جماعت ہر قسم کی معاشرتی ناانصافیوں اور سماجی برائیوں کے خلاف یدھ (جنگ) کر رہی ہے۔ مجھے بھی آپ لوگوں کی سہائتا (مدد) درکار ہے۔"

گپتا مہاراج بھی اب کچھ کھلنے لگے تھے۔ آواز میں ہلکی سی اپنائیت پیدا کرتے ہوئے بولے۔ "وہ تو میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کسی گھور سمیا (سنگین مسئلے) سے دوچار ہیں' ورنہ آپ جیسی سندر ناریاں یوں انجانی جگہوں پر دھکے نہیں کھاتیں' مگر آپ بتائیں تو سہی کہ آپ جیسی دیوی پر کس راکھشس نے ظلم کیا ہے۔ ہم اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

بانو اب خاصی پُر اعتماد نظر آ رہی تھی۔ متوازن لہجے میں بولی۔ "میرا تعلق پرانی دہلی کے علاقے نیمردلی سے ہے۔ میرے پتا وہاں کپڑے کا ہول سیل دھندا کرتے تھے۔ ہمارا گھرانہ بستی کے متمول گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ دو برس پہلے پتاجی کا ہارٹ اٹیک سے دیہانت ہوگیا۔ میری ماں خالص گھریلو عورت تھی جس نے ساری عمر اپنی دہلیز سے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ اس کے علاوہ میرا ایک بھائی تھا جس کی عمر تقریباً نو سال تھی۔

"پتاجی کے مرنے کے بعد سارا کاروبار میری ماں کے بھائی چندو لعل نے سنبھال لیا اور ہم لوگوں کو پتا کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ چند ماہ بعد اس نے میری ماں کو قائل کر لیا کہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے جاننے والے شیاما پرشاد سے کر دی جائے۔ شیاما پرشاد پچھلے دس بارہ برس سے کینیڈا میں مقیم ہے اور مبینہ طور پر مالی لحاظ سے بہت مستحکم ہے۔ میری ماں کو اسی کا انتظار تھا شادی کے دو ہفتے بعد وہ ابدی نیند سو گئی۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی' مگر شاید ابھی مزید صدمے میری قسمت میں لکھے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی روشن لعل صبح سکول جانے سے پہلے حسب معمول اپنی یونیفارم پر استری پھیر رہا تھا کہ استری کی ننگی تار سے چپٹ کر رہ گیا۔ وہ موقع ہی پر ہلاک ہوگیا۔ یہ سانحے اتنی تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے تھے کہ میں وقتی پر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔"

یہ کہہ کر بانو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو ساڑھی کے آنچل سے صاف کیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "پورے سنسار میں شیاما پرشاد اور ماموں چندو لعل کے سوا میرا کوئی غمگسار نہ رہا۔ ویسے اس گھڑی میرے شوہر شیاما پرشاد نے مجھے بھرپور سہارا دیا ورنہ شاید میں آتما ہتیا ہی کر لیتی۔ میں اس کے خلوص کی دل سے قائل ہوگئی اور اسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی۔

"کچھ دنوں بعد اس نے تجویز پیش کی کہ میری صحت کے لیے آب و ہوا اور جگہ کی تبدیلی ضروری ہو گئی ہے اور مجھے تمام جائداد بیچ کر اس کے ساتھ کینیڈا چلے جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کی طویل غیر حاضری کے سبب وہاں اس کا بزنس متاثر ہو رہا ہے۔ ماموں چندو لعل نے بھی اس کی تائید کی۔ میرا ذہن اس وقت قوتِ فیصلہ سے ویسے ہی عاری ہوچکا تھا' لہٰذا تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں نے ہامی بھرلی۔

"ان دونوں نے ایک ماہ کے اندر میرا مکان اور پتاجی کی دکان فروخت کردی اور تمام دوسرے اثاثے بھی مجھ سے ہتھیا لیے۔ یہ ساری جائداد چالیس لاکھ سے زیادہ کی فروخت ہوئی۔ میرا پاسپورٹ پہلے ہی سے تیار کروالیا گیا تھا۔ وقتی طور پر ہم دونوں نے سبھاش نگر دہلی میں چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے لی تاکہ جب تک ویزے کا انتظام نہیں ہو جاتا' وہاں رہ سکیں۔

"چند روز بعد شیاما پرشاد میرے تمام کاغذات لے کر سفارت خانے ویزا لگوانے گیا' مگر ایسا گیا کہ پلٹ کر واپس نہ آیا۔ میں نے جب اس کی تلاش کی تو عقدہ کھلا کہ وہ اسی روز دوپہر کی فلائٹ سے امریکہ جاچکا ہے۔ مزید کھوج پر یہ بھی پتہ چلا کہ وہاں پہلے سے ہی اس کے بیوی بچے ہیں۔ میں ماموں چندو لعل کے گھر جاکر روئی چلائی' مگر اس نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا کہ تم نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے' میں اس معاملے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔

"ایک دو وکیلوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا پولیس میں جعلسازی کی ایف آئی

آر درج کرادوں' مگر کسی مثبت نتیجے کی امید کم ہے۔ پولیس نے مقدمہ تو درج کرلیا مگر الٹا مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا۔ آس پڑوس اور دور پار کے رشتے داروں کا بھی رویہ مختلف نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھاتے وقت میں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا' اب ان کے سامنے دکھڑے رونے سے کیا حاصل۔ اس مرحلے پر اکثر ملنے والوں نے شبہ ظاہر کیا کہ میری ماں اور بھائی کی اموات میں بھی یقیناً شیاما پرشاد ہی ملوث ہے۔ اب میں خود بھی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو یہی لگتا ہے کہ میرے معصوم بھائی کی موت حادثاتی نہیں بلکہ یقیناً اسے قتل کیا گیا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ گپتا جی اس طویل گفتگو کے دوران خاموش رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "مس شانتی ٹھاکر! یقیناً آپ بہت دکھی ہیں۔ آپ کا غم اتنا بڑا ہے کہ حوصلے اور صبر کی تلقین جیسے الفاظ بے وقعت سے لگتے ہیں' مگر اسی کو جیون کہتے ہیں۔ زندگی ایسے ہی حادثات کا دوسرا نام ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا' اب یہ بتائیں کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔"

بانو نے اپنی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ "مہاراج! دنیا میں میرے لیے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ پچھلے کچھ عرصے سے اخباروں اور دیگر ذرائع سے آپ کی تنظیم کا چرچا سنتی رہی ہوں۔ اب یہی آس لے کر آئی ہوں کہ جیسے آپ بھی مظلوموں کی سہایتا کرتے ہیں' اسی طرح اس راکھشس سے انتقام لینے میں میری مدد کریں گے۔ اس کے علاوہ میں خود بھی آپ کے گروہ میں شامل ہو کر ظلم و ناانصافی کے خلاف مظلوموں کی مدد کرنا چاہتی ہوں تاکہ شیاما پرشاد جیسے دیگر ظالم میرے معصوم بھائی جیسے بچوں اور مجھ جیسی بے سہارا عورتوں پر مزید ظلم نہ کرسکیں۔"

یہ سن کر گپتا کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بانو کو اندیشہ ہوا کہ یہ خبیث شخص کہیں انکار ہی نہ کردے' چنانچہ زمانے بھر کی مظلومیت اپنی آواز میں سمیٹتے ہوئے وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"پلیز گپتا جی! انکار مت کیجئے گا' ورنہ میں یہاں سے واپس زندہ نہیں جاؤں گی اور میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔"

گپتا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو سب ٹھیک ہے شریمتی جی! مگر میں اکیلا آپ سے کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہماری تنظیم معاشرتی جرائم کے خلاف لڑ رہی ہے' مگر اس کے کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ کوئی فرد واحد اس بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ ہر کام ہر سطح پر مشاورت اور مربوط طریقے سے ہوتا ہے۔ ویسے آپ ناامید نہ ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہو' اور یہ یقین بھی دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے گروہ نے آپ کی مدد کا فیصلہ کرلیا تو آپ کے مجرموں کو زمین کی تہہ سے بھی نکال لیا جائے گا۔ اب تو آپ واپس چلی جائیں' البتہ اپنی رہائش اور رابطے کا فون نمبر دیتی جائیں تاکہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جاسکے۔"

بانو نے کہا۔ "شریمان! فی الحال تو میں ہوٹل جے محل کے کمرہ نمبر ساٹھ میں ٹھہری ہوں' مگر آپ فیصلہ کرنے میں دیر تو نہیں لگائیں گے نا۔"

گپتا اس کے بچکانہ اصرار پر ہلکے سے مسکرایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "آپ چنتا نہ کریں۔ امید ہے آپ کے حق ہی میں فیصلہ ہوگا۔ اچھا بھگوان نے چاہا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔" بانو کھڑی ہوگئی اور اسے پرنام کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

گپتا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہریں شانتی جی! میں ابھی آپ کو اپنے آدمی کے ساتھ باہر تک بھجواتا ہوں۔ اصل میں یہاں کے کچھ قواعد ہیں۔ کوئی نووارد اکیلا یہاں گھوم پھر نہیں سکتا امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گی۔"

بانو نے فدویانہ لہجے میں کہا۔ "بھلا میں کوئی بات مائنڈ کیوں کرنے لگی۔ آخر ہر ادارے یا تنظیم کے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں ورنہ کام کیسے چلے۔" اتنے میں گپتا کا ماتحت اندر داخل ہوچکا تھا جو بانو کو لئے باہر کی جانب چل پڑا۔ بانو جب مین گیٹ سے باہر نکلی تو سیوا رام کو اپنا منتظر پایا۔ بانو کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی' مگر یہ لمحاتی

کیفیت تھی۔ فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا اور آنکھوں سے بیزاری جھانکنے لگی۔

بانو رکشے میں سوار ہوئی تو وہ کوئی بات کئے بغیر چل پڑا۔ اس کا یہ روٹھا روٹھا سا انداز بانو کو اچھا نہیں لگا۔ تھوڑی دور آنے کے بعد اس نے کہا۔ "سیوا رام! کیا بات ہے؟ تم کچھ ناراض سے لگتے ہو۔ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے؟"

سیوا رام نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ارے شری متی جی! بھلا آپ جیسے بڑے لوگوں سے بھی کبھی غلطی ہوتی ہے۔ غلطی پر تو ہم جیسے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کا یوں اتنی دیر اندر رہنا اچھا نہیں لگا۔ میں تو آپ کو بڑی بھلی مانس ناری سمجھ رہا تھا۔"

بانو کو اس کے احمقانہ ریمارکس پر تاؤ تو بہت آیا مگر ان کی تہہ میں جو مخلصانہ جذبات تھے انہیں محسوس کرکے اس کے دل میں سیوا رام کی عزت اور بڑھ گئی۔ جب وہ امبرفورٹ سے گزر کر آمیر روڈ کی جانب مڑے تو کچھ دور چلنے کے بعد سیوا رام بڑبڑایا۔ "مجھے لگتا ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

بانو چونکتے ہوئے بولی۔ "یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" سیوا رام نے کچھ تیز آواز میں کہا۔ "ارے شری متی جی! ہمارا دل کہتا ہے کہ ہمارا پیچھا ہو رہا ہے اور ہمیں پتہ ہے کہ ہمارا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" بانو آہستگی سے بولی۔ "ایک بات کا دھیان رکھنا کہ تمہاری کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ ہمیں اپنے تعاقب کا علم ہے۔"

سیوا رام خاموشی سے رکشہ چلاتا رہا۔ بانو کے لئے یہ انکشاف اتنا غیر متوقع نہیں تھا' اس لئے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد سیوا رام نے کہا۔ "وہ پیلے رنگ کا سائیکل رکشہ اور آگے جانے والی سرخ موٹر سائیکل مسلسل ہمارے تعاقب میں ہیں۔"

بانو نے دھیرے سے کہا۔ "تم ان پر لعنت بھیجو اور میری بات دھیان سے سنو کیونکہ ہوٹل آنے والا ہے۔ تم مجھے یہاں اتار کر ارجن شرما کے پاس جانا اور اسے بتانا کہ اپنے

تعاقب کی وجہ سے میں آج وہاں نہیں آسکتی اور وہ لوگ بھی فوری طور پر مجھ سے رابطے کی کوشش نہ کریں۔ ویسے انہیں تسلی دینا کہ چنتا کی کوئی بات نہیں۔" سیوا رام اسے ہوٹل کے باہر اتار کر آگے بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد بانو سوچنے لگی کہ شہزاد کا اندازہ بالکل صحیح نکلا ہے' اگر اب یہ مشکل پیدا ہوگئی تھی کہ ان سے رابطہ کیسے کرے۔ وہ اس ڈر سے فون بھی نہیں کر رہی تھی کہ مبادا اس کا فون ٹیپ کیا جا رہا ہو' تاہم وہ خوش تھی کہ معاملات اس کی حسب خواہش آگے بڑھ رہے ہیں۔

رات کا کھانا اس نے نیچے ہال میں کھایا اور اکیلی بیٹھی اپنے موجودہ حالات کی بابت سوچتی رہی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ہال سے اٹھی اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور چند لمحوں کے لئے بے خیالی میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سراپے کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے بعد وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے الماری کی جانب گئی۔ الماری کھلنے پر وہ چند لمحوں کے لئے حیران سی کھڑی رہ گئی۔ صاف نظر آرہا تھا کسی نے اچھی طرح تلاشی لی ہے۔ خصوصاً اس کے اٹیچی کیس اور کپڑوں کا پوری طرح پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا۔ کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر صحیح طرح موجود نہیں تھی۔

وہ کچھ دیر کھڑی یہ سب دیکھتی رہی اور پھر کپڑے اور اٹیچی اٹھا کر پلنگ پر رکھا اور انہیں دوبارہ ترتیب سے اٹیچی کے اندر رکھنے لگی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔ انہی خیالوں میں گم تھی کہ اسے ایک جانب سے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے چونکتے ہوئے اس جانب دیکھا تو خوف کے مارے اس کی چیخ حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر دو ہٹے کٹے بدمعاش اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستولوں کا رخ اس کی جانب تھا۔ اس کے پورے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے ان دونوں مسلح افراد کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی

تھی۔

دونوں افراد نپے تلے قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بانو کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ ان کی نگاہوں کا مرکز وہی تھی اور وہ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی انہیں تکے جا رہی تھی۔ تمام عمر اسے ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

ابھرے بدن والا طویل القامت شخص چند لمحے بانو کو گھورتا رہا پھر اپنے پستول کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے غرایا۔ "سچ بتاؤ تم کون ہو اور کہاں کی رہنے والی ہو؟" بانو کے لیے اگرچہ یہ سب کچھ غیر متوقع نہیں تھا مگر اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ "میں شانتی ٹھاکر ہوں' مگر تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ یوں چوروں کی مانند کمرے کی تلاشی کا کیا مقصد ہے؟"

اس بار طویل قامت ہی گویا ہوا تھا۔ "اس کا جواب بھی تمہیں جلد مل جائے گا' مگر فی الحال میری بات غور سے سنو۔ اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو یہیں ڈھیر کر دی جاؤ گی۔ بہتری اسی میں ہے کہ جیسے ہم کہیں اس پر عمل کرو۔" بانو کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔ "مگر تم ہو کون اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

وہ سرد آواز میں بولا۔ "ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔ ورنہ تمہیں بے ہوش کر کے لے جانا پڑے گا اور یہ صورتِ حال تمہارے لیے زیادہ بہتر نہ ہو گی۔" بانو کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اور وہ شور مچا کر اپنی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی' لہٰذا اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔"

نووارد کی آواز میں بھی اب قدرے ٹھہراؤ تھا۔ "ہمارے پستول بظاہر ہماری جیبوں میں ہوں گے لیکن باہر نکل کر اگر تم نے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کی تو نتائج کی ذمے داری تم پر ہو گی۔"

بانو کچھ کہے بغیر ان کے ساتھ چل پڑی۔ دروازے سے باہر نکل کر طویل قامت کے ساتھی نے کمرہ باہر سے مقفل کر کے چابی اپنی جیب میں ڈالی اور بانو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

دونوں اسے اپنے حصار میں لیے سیڑھیوں سے نیچے اترے اور ہال سے ہوتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت ہال میں خاصے لوگ موجود تھے مگر کسی نے بھی بانو کی اڑی ہوئی رنگت پر دھیان نہ دیا۔

ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی سفید رنگ کی "ماروتی" کار کے نزدیک پہنچے تو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شخص نے جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ طویل قامت نے بانو کو پچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کا ساتھی دوسری جانب سے بانو کے بائیں طرف آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی' اس لیے سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ بانو' جے پور سے زیادہ واقف نہ تھی' اس لیے وہ اندازہ نہ لگا سکی کہ اسے کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے کے سفر میں کئی چھوٹی بڑی سڑکوں پر مڑنے کے بعد ایک کوٹھی نما مکان میں داخل ہوئی۔

گاڑی صحن میں رکی تو طویل قامت نے بانو کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح ان کے احکام پر عمل کر رہی تھی۔ دونوں اسے اپنے ساتھ لیے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ خوبصورت فرنیچر اور قالین سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے مکین خاصے خوشحال ہیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد طویل قامت نے اسے سامنے پڑے صوفے پر دھکیلتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ "اب بتاؤ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

بانو کی آواز میں خوف کے ساتھ حیرت بھی شامل تھی۔ "میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ بھی' یا یوں ہی دھمکیاں دیتے جاؤ گے۔" وہ شخص یک دم کھٹکنے کتے کی

طرح غرایا اور پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”آنند ذرا مہارانی جی کو بتاؤ کہ انہوں نے کیا اپرادھ کیا ہے۔“

آنند اوسط قد کا گورا چٹا شخص تھا۔ وہ بانو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شری متی شانتی ٹھاکر! میں ذرا تفصیل سے تمہیں جرم سے آگاہ کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ ہم تمہارے پتی شیاما پرشاد کے آدمی ہیں جس کے خلاف مدد لینے کے لیے تم پاپی گروہ کے پاس گئی تھی۔ کیا تم نے شیاما پرشاد کو اتنا بے وقوف سمجھ لیا تھا کہ وہ تمہاری طرف سے بالکل غافل ہو جاتا۔“

یہ الفاظ سن کر بانو کو عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ خوف کی جگہ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے تھے کیونکہ اسے علم تھا کہ شیاما پرشاد نامی کسی شخص کا ہرگز کوئی وجود نہیں۔ وہ کہانی تو اس نے محض اس لیے گھڑی تھی کہ پوتر پاپی گروہ میں شمولیت کی راہ ہموار ہو سکے مگر اب اپنے سامنے مبینہ خاوند کے غنڈے دیکھ کر وہ خود کو پاگل محسوس کر رہی تھی۔ اسے یہ گورکھ دھندا بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کیفیت میں شاید وہ سچ اگل دیتی مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پاپی گروہ کے لوگ اس کی بیان کردہ کہانی کی تصدیق کے لیے یہ سارا ڈراما رچا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اس کا ڈر خاصا کم ہو گیا اور وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”ہوں! تو تم اس حرامی شیاما پرشاد کے پالتو ہو جسے انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ کہاں ہے وہ؟ مجھے اس کے پاس لے چلو تاکہ میں اس کمینے سے پوچھ سکوں کہ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا۔ اس نے چند ٹکوں کی خاطر میرا ہنستا بستا خاندان تباہ کر دیا میں اس کتے سے بدلہ لینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہ گئی تھی۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”اسے بتا دینا کہ اگر اس گروہ کے لوگ میری مدد کے لیے آمادہ نہ بھی ہوئے تو میں تنہا ہی اسے ڈھونڈ کر اپنی بے قصور ماں اور معصوم بھائی کی ہتیا کا انتقام لوں گی۔ وہ دنیا کے کسی

بھی کونے میں جا چھپے‘ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی کیونکہ اسے عبرتناک موت مارنا ہی اب میرے جیون کا مقصد رہ گیا ہے۔ میں تم لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھے اس کا پتہ بتا دو۔“

یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور آگے بڑھ کر آنند کا گریبان پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ ”کہاں ہے وہ ذلیل شخص؟ جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ آنند اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولا۔ ”پیچھے ہٹو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے! تم پاگل تو نہیں ہو گئی؟“ بانو پر واقعی اس وقت جنون طاری تھا۔ آنند کا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچتے ہوئے وہ شیاما پرشاد کو بددعائیں دے رہی تھی۔ آنند نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا اور صوفے پر دھکیل دیا۔

اس دوران طویل قامت خاموش کھڑا گہری نظروں سے بانو کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نے آنند کی طرف مڑ کر کہا۔ ”فی الحال اسے یہیں بند کر دو۔ ہم چل کر شیاما پرشاد جی کو اس کی بابت اطلاع دیتے ہیں۔“ اس کے بعد وہ دونوں باہر کی طرف بڑھے اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ بانو دروازہ پیٹتے ہوئے بلند آواز سے چلا رہی تھی۔ ”بلاؤ اس حرامی شیاما پرشاد کو۔ آج میں سارا حساب چکا دوں گی۔“

آنند اور طویل قامت اس کی چیخ و پکار نظرانداز کرتے ہوئے ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے میز پر دھرے ٹیلی فون کے ذریعے کسی سے رابطہ کیا اور طویل قامت مؤدب لہجے میں بات کرنے لگا۔ ”ہیلو گپتا جی! میں بجرنگ بول رہا ہوں۔ ہم شانتی کو لے آئے ہیں‘ مگر ہمارے مشاہدے کے مطابق وہ واقعی شیاما پرشاد نامی اپنے پتی کے ہاتھوں ستائی ہوئی عورت ہے...... جی میں نے باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ فراڈ بالکل نہیں لگتی۔ اس سلسلے میں آپ کے خدشات بالکل بے بنیاد ہیں۔ جی ہاں! میں یہ بات پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے ہم ابھی اسے واپس ہوٹل چھوڑ آتے ہیں۔“

☆======☆======☆

سیوا رام، بانو کو ہوٹل چھوڑنے کے بعد باہر نکلا اور کچھ دیر عام رکشہ ڈرائیوروں کی طرح اِدھر اُدھر سواریوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا تاکہ اگر وہ بھی زیرِ نگرانی ہو تو نگرانی کرنے والوں کو یقین آجائے کہ وہ محض ایک رکشہ ڈرائیور ہی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے تو وہ چاند پول گیٹ کے باہر مراد کے مکان پر پہنچا۔

وہاں مراد کے علاوہ راجیو اور آشا بھی موجود تھے۔ اسے دیکھ کر ان تینوں کے چہرے کھل اٹھے۔ نمسکار کرنے کے بعد سیوا رام بھی ان کی بات چیت میں شامل ہو گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی آشا نے بے تاب لہجے میں کہا۔ "سیوا رام جی! آپ کہاں رہ گئے تھے؟ ہم تو کب سے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔ کہو شانتی دیدی کس حال میں ہیں؟"

سیوا رام کرسی کی پشت پر ٹیک لگاتے ہوئے قدرے مسکرایا۔ "آشا جی! کچھ دھیرج سے کام لیں۔ آپ نے تو آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پہلے مجھ سے چائے پانی کا تو پوچھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے گنیش مارکہ بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی سلگانے لگا۔ آشا اس کے اس انداز بے نیازی پر کچھ جھنجلا سی گئی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

راجیو نے دھیرے سے کہا۔ "سیوا رام جی! آشا صحیح کہہ رہی ہے۔ ہم خاصی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔" سیوا رام ان کی اس کیفیت سے کچھ دیر لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس وقت لاشعوری طور پر اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا آخر اس نے اپنی خاموشی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "آشا جی! ہمارا آج کا مشن ظاہری طور پر خاصا کامیاب رہا ہے۔ میں نے واپسی پر شانتی جی کو بحفاظت ہوٹل پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے آپ لوگوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ ان سے رابطہ کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ وہ مناسب وقت پر خود رابطہ کر لیں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پورے دن کی کارگزاری کی تفصیل انہیں سنا ڈالی۔

اس کی بات ختم ہونے کے بعد فوری طور پر کسی نے کچھ نہ کہا۔ سبھی اپنی جگہ

خاموشی سے بیٹھے مختلف خیالات میں گم تھے۔ کچھ دیر بعد مراد آہستگی سے بولا۔ "ہمیں اپنے طور پر شانتی کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرنا ہو گا ورنہ وہ کسی مصیبت میں پڑ سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ہماری مداخلت سے معاملات بگڑ بھی سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے فی الحال شانتی جی کو کسی فوری خطرے کا سامنا نہیں۔ ہمیں ان کی طرف سے رابطے کا انتظار کرنا چاہیے۔" راجیو نے رائے دی۔

مراد نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ آشا اٹھ کر کچن کا رخ کرتے ہوئے کہتی گئی۔ "آپ لوگ باتیں کریں میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

کھانے کے دوران میں بھی گفتگو کا محور یہی موضوع رہا۔ کھانے کے بعد راجیو چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارجن جی! آپ نے ساری بات سن تو لی ہے۔ آپ کے خیال میں ہمیں کون سا قدم اٹھانا چاہیے؟" مراد کے بجائے سیوا رام نے جواب دیا۔ "میرے وچار میں تو ہمیں فی الحال خاموشی سے تمام صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ حالات ہمارے لیے خود ہی کوئی نہ کوئی راہ متعین کر دیں گے۔"

مراد طویل سانس لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تم کسی حد تک صحیح کہہ رہے ہو۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ ہم خاموش رہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم فقط تماشائی بن کر رہ جائیں اور ساری ذمے داری شانتی پر ڈال دیں۔ ہمیں اپنے طور پر متبادل راستوں کی تلاش جاری رکھنا ہو گی۔"

راجیو کے ذہن میں غالباً کوئی نیا خیال آیا۔ تبھی تو وہ ہلکی سی چٹکی بجاتے ہوئے گویا ہوا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پوتر پاپی اتنے کمزور ہرگز نہیں کہ محض شانتی دیدی یا کوئی دوسرا فرد واحد ان کا کچھ بگاڑ سکے۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ ہم کسی طرح ان میں باہمی نفاق ڈال دیں جس سے ان میں دھڑے بندی پیدا ہو جائے۔ ان کے آپسی ٹکراؤ سے ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔"

مراد نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر کیسے، راجیو؟ یہ کام کہنے میں جتنا آسان ہے کرنے میں اسی قدر مشکل ہے۔"

راجیو کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگا۔ "ارجن جی! پہلے مجھے بات تو مکمل کرنے دیں۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ یہ بڑا آسان کام ہے مگر ناممکن بہرحال کوئی بات نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا جس سے لگتا تھا اسے اپنے منصوبے کی معقولیت کے بارے میں خود بھی اعتماد نہیں۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ سبھی اپنے طور پر اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ مراد، راجیو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ "راجیو! اب چند کام تمہیں کرنا پڑیں گے۔ کچھ روز پہلے تم نے کہا تھا کہ جے پور کی حد تک تم خاصے بارسوخ ہو اور اس گروہ کے مقابلے میں اتنے تر نوالے بھی نہیں ہو۔"

راجیو نے اس کی بات کا برا مانتے ہوئے کہا۔ "ارجن جی! آپ کے لہجے میں اگرچہ کسی قدر طنز کا عنصر موجود ہے مگر میں اپنی کہی بات پر ہنوز قائم ہوں اور وقت ثابت کرے گا کہ میں نے محض بڑ نہیں ہانکی تھی۔"

مراد اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم آواز میں گویا ہوا۔ "میرے دوست! شاید تم نے میری بات محسوس کی ہے۔ میرا مقصد تمہاری دل شکنی ہرگز نہیں تھا۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ جے پور یا اس کے گرد و نواح میں کوئی ایسا بااثر شخص موجود ہے جو اس گروہ کے مقابلے میں کھلے عام ہماری سرپرستی کر سکے۔"

آشا اور راجیو نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا اور تقریباً بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا۔ "ہاں کرنل بھوانی سنگھ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

مراد نے ٹٹولنے والی نظریں ان پر ڈالیں۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

راجیو کسی قدر حیرانی سے کہنے لگا۔ "ارجن جی! آپ بھوانی سنگھ کو نہیں جانتے؟

وہی تو اس وقت جے پور کے مہاراجہ ہیں۔ اگرچہ ریاستیں ختم ہوئے مدت گزر گئی لیکن سابق حکمران خاندان کی قدر و منزلت آج بھی لوگوں کے دلوں میں ہے۔ گزشتہ بیس سال سے کرنل بھوانی سنگھ کی والدہ راج ماتا گائتری دیوی جے پور سے پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوتی آئی ہیں، البتہ ۱۹۷۷ء کی جنتا لہر کے دوران وہ بھی اپنی سیٹ ہار گئیں اور جنتا پارٹی کے گردھاری لعل ویاس لوک سبھا کی سیٹ جیت گئے۔ اس ہار سے "راج ماتا" اتنی دلبرداشتہ ہوئیں کہ انھوں نے سیاست سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے راجیو سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ مراد پورے انہماک سے اس کی جانب متوجہ تھا کیونکہ اسے روشنی کی ہلکی سی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد راجیو نے اپنی بات مزید آگے بڑھائی۔ "گائتری دیوی کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے بیٹے کرنل بھوانی سنگھ نے سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ وہ کانگرس آئی کے پلیٹ فارم سے سیاست کر رہے ہیں۔ ابھی تک جنتا پارٹی کے گردھاری لعل ہی لوک سبھا کے ممبر ہیں مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے ماہ جنتا پارٹی کی آپسی پھوٹ کے نتیجے میں مرار جی ڈیسائی حکومت ختم ہو گئی ہے اور اندرا کانگرس کی حمایت سے چودھری چرن سنگھ وزیر اعظم بن گئے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اندرا گاندھی کسی بھی وقت اپنی حمایت واپس لے سکتی ہیں جس کے نتیجے میں مڈ ٹرم انتخابات ناگزیر ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے تمام سیاسی جماعتیں اور شخصیات آئندہ الیکشن کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔"

راجیو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تو مراد نے کہا۔ "تم نے خاصی لمبی تمہید باندھی ہے، مگر شاید ہم اصل موضوع سے ہٹ چکے ہیں۔ ہمارا مقصد بھارتی سیاست پر گفتگو نہیں۔"

راجیو دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہنے لگا۔ "نہیں مسٹر ارجن! میں اصل موضوع ہی پر آرہا ہوں۔ جے پور میں سبھی کو معلوم ہے کہ موجودہ رکن پارلیمنٹ گردھاری لعل کو پوتر پاپی گروہ کی مکمل آشیرواد حاصل ہے اور یہ بات بھوانی سنگھ کے

لیے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے کیونکہ جے پور میں یہ گروہ خاصا مقبول ہے مگر ابھی تک بھوانی سنگھ اس کا توڑ دریافت نہیں کر پایا۔ اگر ہم کسی طرح کرنل کو یہ یقین دلا سکیں کہ ہم پوتر پاپیوں کے خلاف اس کے مضبوط حلیف ثابت ہو سکتے ہیں تو وہ لازماً ہماری سرپرستی کرے گا اور اسی طرح ہم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

سیوا رام اور آشا ساری بات چیت کے دوران قطعاً خاموش رہے تھے۔ مراد چند لمحے تینوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "مسٹر راجیو! یہ بات ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم بھوانی سنگھ کو استعمال کریں گے یا وہ ہمیں اپنے مفاد کے لیے بطور چارہ استعمال کرتا ہے، لیکن ہمیں بہرحال اس سے رابطہ کرنا ہوگا۔" رات گئے تک وہ صلاح مشورے میں مصروف رہے اور آئندہ کی حکمت عملی طے کر کے اٹھے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ سیوا رام تو اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا، البتہ راجیو اور آشا نے رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆======☆======☆

بانو کو بحفاظت واپس ہوٹل پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے اعصاب نہایت کشیدہ تھے۔ اگرچہ حالات اس کی توقع کے مطابق وقوع پذیر ہو رہے تھے اور نتائج بھی زیادہ حوصلہ شکن نہیں تھے، اس کے باوجود گزشتہ رات کے واقعے نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر کمزور وکٹ پر کھڑی ہے جہاں کسی وقت بھی کوئی بڑا سانحہ رونما ہو سکتا ہے۔ دوسری جانب اسے یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ وہ مراد سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ایسے حالات میں اسی سے کچھ رہنمائی حاصل ہو جاتی۔

اگلے دو روز اس نے ہوٹل ہی میں گزارے تھے۔ وہ یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ اسے خود پوتر پاپیوں سے رابطہ کرنا چاہیے یا ان کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ گیتا سے ملاقات کے دوران اس نے ان کے بارے

میں بات کیوں نہیں کی۔

شام کے چھ بجنے والے تھے لیکن گرمی کی حدت اب بھی برقرار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کچھ دیر کھلی فضا میں وقت گزارنا چاہیے۔ وہ ابھی اسی ادھیڑبن میں تھی کہ کمرے کے دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی کہ جانے اس وقت کون ٹپک پڑا ہے۔ بستر سے اٹھ کر وہ محتاط قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی۔ اس دوران دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا اور ایک جانب سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے کا پٹ کھول کر اندر داخل ہونے والی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ نمسکار کرنے کے بعد نووارد عورت پر اعتماد قدموں سے چلتی ہوئی صوفے کی جانب بڑھی۔ اس نے سادہ پرنٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ قدرے فربہ جسم کی مالک یہ عورت خاصی باوقار لگ رہی تھی۔

صوفے پر بیٹھنے کے بعد وہ بانو سے مخاطب ہوئی۔ "شانتی جی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خود میزبان ہو اور بانو اس سے ملنے آئی ہو۔ بانو کچھ کہے بغیر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "جی فرمائیے! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں؟" وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا نام شوبھا پنڈت ہے اور جہاں تک سیوا کا تعلق ہے وہ تو ہم آپ کی کریں گے۔"

بانو اس کے ذو معنی جواب سے کچھ گڑبڑا سی گئی تھی، مگر اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی، چند لمحے شوبھا پنڈت اس کے سراپے کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ "مس شانتی ٹھاکر! مجھے گپتا جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب کسی چنتا کی ضرورت نہیں۔ سبھی معاملات ہم لوگ خود ہینڈل کر لیں گے۔ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ مسٹر گپتا آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

بانو یہ سن کر خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ "مجھے کہاں چلنا ہوگا آپ کے ساتھ؟" شوبھا

پنڈت کی آواز میں شفقت کا رنگ غالب تھا۔ ”میں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ چلیں جلدی تیار ہو جائیں۔“

بانو نے کچھ سوچ کر خود کو پوری طرح حالات کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ باتھ روم کی جانب بڑھی، منہ دھو کر کپڑے بدلے اور کچھ دیر بعد وہ شوبھا پنڈت کے ہمراہ ہوٹل سے باہر نکل رہی تھی۔ سرخ رنگ کی فیسٹ کار میں بیٹھ کر شوبھا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور بانو کے لیے اگلا دروازہ کھول دیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد شوبھا پنڈت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆------☆------☆

راجیو اور مراد خاصی سوچ بچار کے بعد حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں فوراً کرنل بھوانی سنگھ سے رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ اس مرحلے پر کسی طاقتور شخصیت کی پشت پناہی کے بغیر وہ اپنے منصوبے کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ راجیو نے فون پر کرنل بھوانی سنگھ کے نمبر ڈائل کیے تو دوسری جانب سے اس کے سیکرٹری نے فون اٹھایا تھا۔ ”جی آپ کون صاحب ہیں اور کرنل صاحب سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟؟“

”مسٹر! میرا نام راجیو ہے اور میرا تعلق پوتر پاپی سنگٹھن سے ہے۔ میں چند اہم معلومات کرنل صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“ یہ سنتے ہی سیکرٹری نے کرنل سے اس کی بات کرا دی تھی۔

کرنل کی آواز خاصی دبنگ تھی۔ ”ہاں تو مسٹر راجیو! آپ کا تعلق بھلے ہی کسی سے بھی ہو۔ ایسی باتیں فون پر مناسب نہیں ہوتیں۔ ویسے بھی میں اس وقت مصروف ہوں۔ آپ ایک گھنٹے بعد ٹھیک گیارہ بجے میرے پاس آ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

راجیو کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا تھا۔

مراد اور راجیو کچھ دیر بعد کرنل کی رہائش گاہ راج نواس کے لیے روانہ ہو گئے۔

مراد اس محل نما عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ بھلے ہی ریاستیں وغیرہ ختم ہو گئیں ہیں، مگر سابق حکمرانوں کے ٹھاٹھ باٹھ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا رہن سہن ابھی تک ان کے شاندار ماضی کا آئینہ دار تھا۔ اس سلسلے میں ان کی معاونت وہ خزانے کر رہے تھے جنہیں ان کے آباؤ اجداد نے عوام کا خون نچوڑ کر بھرا تھا اور لگتا تھا آنے والی کئی نسلوں کے لیے بھی یہ دولت خاصی ہو گی۔

انہی خیالات میں گم وہ ایک شاندار ہال میں داخل ہوئے۔ یہ ڈرائنگ روم کسی مغل دربار کے دیوانِ خاص کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد مہاراج کرنل بھوانی سنگھ کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ راجستھان کے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ طویل قامتی اور سرخ و سپید رنگت نے اس شخص کی جسمانی وجاہت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ راجیو کو دیکھ کر مراد نے بھی اظہار تعظیم کے لیے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ کرنل کے ساتھ تقریباً تیس سال کا عام چہرے مہرے کا شخص بھی اندر آیا۔

کرنل کے بیٹھنے کے بعد ان تینوں نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ فوراً ہی چند ملازم چائے کا سامان لیے اندر داخل ہوئے۔ مراد کو لگ رہا تھا جیسے وہ قرونِ وسطیٰ کے دور میں پہنچ چکا ہو۔ چائے پیش کرنے کے بعد ملازمین کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں ان چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کرنل کی عمر اگرچہ پچاس سے تجاوز کر چکی تھی مگر دیکھنے میں وہ پینتیس چالیس کا ہی لگ رہا تھا۔

اس نے خود چائے نہیں پی بلکہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بنا کچھ کہے خاصی دیر ان دونوں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔

راجیو اس سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔ خود مراد بھی اس کی باوقار شخصیت سے متاثر تھا، مگر اس کی کیفیت راجیو والی بہرحال نہیں تھی۔ کرنل نے انہیں نگاہوں ہی سے خاصی دیر تک جانچنے کے بعد پوچھا۔ ”ہاں تو مسٹر راجیو! آپ نے کس سلسلے میں مجھ سے ملنے کی زحمت کی؟“

راجیو اس کے سامنے کچھ زیادہ ہی دب سا گیا تھا' لہٰذا مراد نے خود بات کرنا مناسب جانا۔ "مہاراج! مجھے ارجن شرما کہتے ہیں۔ ہمارا تعلق عرصے سے پوتر پاپی گروہ سے ہے' مگر اب مسٹر ترپاٹھی کی پالیسیوں سے اختلاف کی بنا پر ہم نے ان سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے ساتھ کارکنوں کی بڑی تعداد ہے۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ یہ گروہ آپ کا بھی سخت مخالف ہے' لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ آپ ہماری سرپرستی کریں تاکہ ہم اور آپ اپنے مشترکہ دشمن کو ختم کر سکیں۔"

کرنل کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا۔ "وہ سب تو ٹھیک ہے' مگر تم لوگ اب ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو اور اس کے بدلے ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہو؟" مراد کی آواز پُراعتماد' مگر دھیمی تھی۔ "ہمیں آپ سے ہر طرح کی پشت پناہی چاہیے جس میں مالی وسائل سے لے کر افرادی قوت کی فراہمی بھی شامل ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس گروہ کو ختم کرنے کے علاوہ آپ کی انتخابی مہم میں بھی بھرپور معاونت کریں گے۔"

بھوانی سنگھ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "شاید تم لوگ ان سے واقف ہو۔ یہ ڈاکٹر چندر بھان ہیں۔ راجستھان یوتھ کانگرس آئی کے صدر اور ہمارے معاون خصوصی اور ...."

اس کی بات ادھوری تھی کہ بیرونی دروازے پر ہلکی سے دستک کے بعد کرنل کا سیکرٹری اندر داخل ہوا۔ کرنل کے قریب آکر سر جھکاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز سے بولا۔ "سوری مہاراج! دخل اندازی کے لیے معافی چاہتا ہوں' مگر اطلاع دینا ضروری تھا۔ ابھی دہلی سے خبر موصول ہوئی ہے کہ راشٹرپتی نیلم سنجیو ریڈی نے لوک سبھا توڑ دی ہے کیونکہ پردھان منتری چودھری چرن سنگھ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے خود ہی پارلیمنٹ توڑنے کی سفارش کی ہے۔ دیش میں مڈ ٹرم الیکشن کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ الیکشن تک چرن سنگھ کو ہی عبوری وزیر اعظم مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں

آج سہ پہر دہلی میں کانگرس پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں ٹکٹوں کی تقسیم کا معاملہ زیرِ غور آئے گا' لہٰذا آپ سے دہلی پہنچنے کی درخواست کی گئی ہے۔" یہ سن کر کرنل کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ اپنے سیکرٹری کو باہر جانے کا کہہ کر وہ دوبارہ مراد اور راجیو کی طرف متوجہ ہوا۔ "ابھی ہم جس بارے میں بات کر رہے تھے وہ مرحلہ بہت قریب آ گیا ہے۔ اس الیکشن میں ہم لوک سبھا سیٹ کے لیے چناؤ لڑیں گے جبکہ ہمارے یہ کامریڈ ڈاکٹر چندر بھان صوبائی نشست کے لیے امیدوار ہوں گے۔

"پچھلے چناؤ میں جنتا پارٹی کے گردھاری لعل' راج ماتا کو شکست دے چکے ہیں جو ہمارے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہے۔ ہمارے نزدیک لوک سبھا سیٹ جیتنا یا ہارنا اتنا اہم نہیں' مگر جے پور ریاست سے جہاں ہزاروں سال سے ہمارے باپ دادا حکمران رہے ہیں۔ ہمارے خاندان کا ہارنا محض ایک نشست کی ہار نہیں بلکہ ہمارا تمام تر خاندانی پس منظر گہنا جانے کے مترادف ہے' لہٰذا اب ہم یہاں سے شکست افورڈ نہیں کر سکتے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ میرے پاس تو آپ لوگوں کے لیے فی الحال زیادہ وقت نہیں' مگر آپ ڈاکٹر چندر بھان سے مزید مشاورت کے بعد اپنی آئندہ حکمت عملی طے کر لیں لیکن یہ خیال رہے کہ ہمیں جے پور کی سیٹ ہر قیمت پر جیتنی ہے۔ آپ کو جو بھی مدد درکار ہو' ڈاکٹر بھان کو بتا دیں۔ ویسے ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مجھے پوتر پاپی گروہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں اور ترپاٹھی کو بھی میں اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی قسم کی دوستی یا دشمنی رکھی جائے مگر وہ ہماری انتخابی سیاست کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا ہے' لہٰذا اسے ختم کرنے کے لیے تم لوگوں کو ہر طرح کی مدد فراہم کی جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں کیونکہ مجھے ایک بجے کی فلائٹ سے دہلی پہنچنا ہے۔ آپ ڈاکٹر سے تمام معاملات طے کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی کرنل بھوانی کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی احتراماً اپنی سیٹوں سے اٹھ گئے اور جب تک وہ کمرے سے نکل نہیں گیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ مراد قدم قدم پر

محسوس کر رہا تھا کہ حکومت جانے کے باوجود حکمرانی کا نشہ ہنوز باقی تھا۔

اب کمرے میں وہ تینوں ہی تھے۔ ڈاکٹر چندر بھان نے ملازم کو بلا کر کہہ دیا تھا کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے کیونکہ وہ اہم بات چیت میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد وہ مراد کی جانب متوجہ ہوا۔ "ہاں مسٹر ارجن شرما! آئندہ کی پلاننگ کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم کچھ ابتدائی مگر بنیادی معلومات کا تبادلہ کر لیں۔ پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ اس گروہ میں آپ کے ہم خیال کتنی طاقت رکھتے ہیں اور کن شعبوں میں آپ کو ہماری مدد درکار ہے؟"

مراد اس کا مدعا سمجھ رہا تھا۔ "ڈاکٹر چندر بھان! اپنی طاقت یا کمزوری کا اظہار خود اپنے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا کہ ہم میں کس قدر اہلیت ہے۔ البتہ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اس گروہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور........"

ڈاکٹر چندر بھان اس کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں مگر یہاں پر میں آپ کی ایک بہت بڑی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارا مقصد اس گروہ کا خاتمہ ہرگز نہیں کیونکہ شاید آپ کو اس گروہ کے قیام کا صحیح پس منظر معلوم نہیں۔ یہ گروہ تو بھارت کے قومی مفادات کا بہت بڑا محافظ ہے۔ ہمارا مقصد اس کی موجودہ قیادت کو ہٹانا ہے کیونکہ موجودہ قیادت کا جھکاؤ بوجوہ بھارتی جنتا پارٹی کی مقامی قیادت کی طرف ہے۔ جب کہ ہماری خواہش ہے کہ یہ گروہ کم از کم جے پور کی حد تک اپنا وزن کانگرس کے پلڑے میں ڈال دے اور اپنی موجودہ قومی خدمات کو اسی طریقے سے جاری رکھے۔"

مراد اس کی بات سن کر بری طرح چونکا تھا۔ "ڈاکٹر! آپ کی گفتگو سے میں کچھ کنفیوز سا ہو گیا ہوں۔ آپ بار بار قومی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں اور پوتر پاپی گروہ کو قومی مفادات کا محافظ قرار دے رہے ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟"

ڈاکٹر خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ کئی منٹ وہ اسی حالت میں رہا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مسٹر ارجن شرما! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کے ساتھ اس بارے میں بات کرنی چاہئے یا نہیں مگر خیر جب ہم اکٹھے کام کر رہے ہیں تو ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرنا پڑے گا۔"

مراد اس کی تمہید سے کچھ اکتا گیا تھا۔ "ڈاکٹر! آپ کھل کر بات کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ایسے معاملات میں گھما پھرا کر بات کرنے سے اکثر اوقات غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔" ڈاکٹر چندر بھان بھی اب کچھ کھل گیا تھا۔ "شرما جی! مجھے امید ہے آپ اس بات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خود تک محدود رکھیں گے کیونکہ یہ دیش کے مفادات کا معاملہ ہے۔ شاید آپ کو علم نہ ہو کہ اس گروہ کی تشکیل تین سال قبل کانگرس آئی کی مرکزی سرکار کے حکم پر ہی کی گئی تھی۔ حکومتی اکابرین اور خفیہ سرکاری اداروں کی قیادت کا خیال تھا کہ حکومتی ادارے ہمسایہ ممالک خصوصاً پاکستان کے اندرونی معاملات میں ایک حد سے زیادہ ملوث نہیں ہو سکتے کیونکہ بین الاقوامی سطح پر بدنامی کا خوف ہر معاملے میں آڑے آتا ہے جس کی وجہ سے حکومتی ادارے کھل کر بعض کام نہیں کر سکتے۔ لہٰذا کسی ایسی غیر سرکاری تنظیم کا وجود ضروری قرار دیا گیا جس کا بظاہر حکومت یا سرکاری اداروں سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو تا کہ اس تنظیم کی سرپرستی میں ہم پاکستان جیسے ممالک میں اپنی مرضی کا کردار ادا کر سکیں اور وہاں ہر طرح کی لسانی، گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کو ہوا دے کر دہشت گردی کا بازار گرم کر سکیں۔ اس طرح "ہینگ لگے نہ پھٹکری" کے مصداق خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جا رہے ہیں۔

"گزشتہ چند سال سے پاکستانی صوبہ سندھ میں کئی حوالوں سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس بے چینی کو بڑھاوا دینے کے لیے مجوزہ نئی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر سندھ سے ملحقہ بھارتی صوبے راجستھان میں قائم کیا گیا۔ تب سے یہ گروہ سندھ میں لسانی اور سیاسی بنیادوں پر خاصی منافرت پیدا کر چکا ہے اور اس کا کوئی ٹھوس الزام بھی بھارت سرکار پر

نہیں لگ سکتا۔ اگر پاکستان میں ہمارا کوئی ایجنٹ پکڑا بھی جاتا ہے تو وہ یہی بتاتا ہے کہ اس کا تعلق ایک غیر سرکاری مذہبی اور سماجی تنظیم "پوتر پاپی" سے ہے۔ اس طرح سفارتی سطح پر خفت اٹھائے بغیر ہمیں اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔"

مراد یہ باتیں سنتے ہوئے خود کو ذہنی طور پر مفلوج سا محسوس کر رہا تھا کیونکہ بظاہر سب کچھ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا مگر سامنے موجود حقائق کو وہ جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جرائم پیشہ گروہ بھارت سرکار کے باقاعدہ ادارے کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر چندر بھان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "۱۹۷۷ء میں اندرا گاندھی کے اقتدار سے ہٹنے کے باوجود اس گروہ کو "را" اور مرکزی حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور یہ پاکستان کو کھوکھلا کرنے کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔ اس کے صدر مسٹر ترپاٹھی جے پور سے جنتا پارٹی کے لوک سبھا ممبر گردھاری لعل کے کالج فیلو رہے ہیں۔ اسی ذاتی وابستگی کی وجہ سے وہ یہاں کی مقامی سیاست میں کانگرس کے مخالف فریق کی مدد کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم صرف انہیں راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں مگر اس تنظیم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔"

ڈاکٹر چندر بھان نے مراد کی حیرت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے شرما جی؟ آپ تو کہیں اور ہی کھوئے ہوئے لگ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" مراد خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوا۔ "ڈاکٹر صاحب' میں ٹھیک ہوں۔ ذرا اس بارے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کام ایسے کرنا ہو گا کہ سانپ بھی نہ مرے اور اس کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے جائیں۔"

راجیو کو بھی اس گروہ کی اصلیت جان کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست شخص تھا' اس لیے اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ ان کی حکومت پاکستان دشمنی میں اس حد تک گر گئی ہے کہ انسانیت اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کو بھی فراموش کر بیٹھی ہے۔

☆==-===☆======☆

بانو اور شوبھا ہوٹل سے سیدھی پوتر پاپی سنگھٹن کے مقامی ہیڈ کوارٹر پہنچی تھیں۔ جہاں چند روز قبل بانو کی گپتا جی سے ملاقات ہوئی تھی۔ مین گیٹ میں داخل ہونے کے بعد ان کی گاڑی بائیں جانب وسیع و عریض گراؤنڈ کی جانب بڑھی جسے غالباً کار پارکنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی سے آٹھ دس گاڑیاں کھڑی تھیں۔

بانو کو عمارت کی وسعت پر خاصی حیرانی ہو رہی تھی کیونکہ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ قلعہ نما عمارت اتنے زیادہ رقبے پر پھیلی ہو گی۔ جے پور کی اکثر عمارتوں کی طرح اس کی تعمیر میں بھی اینٹوں کی بجائے پتھر استعمال کیا گیا تھا۔

شوبھا پنڈت انجن بند کر کے نیچے اتری اور بانو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک جانب بڑھی۔ بانو نے بھی مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کی تقلید کی۔ اصل عمارت میں داخل ہونے کے بعد کئی راہداریاں مڑنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا جسے لکڑی کی پارٹیشن کے ذریعے تین مختلف حصوں میں بانٹا گیا تھا۔

شوبھا پنڈت اسے لیے جس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئی اس کی سج دھج سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ شوبھا کمرے کے وسط میں رک کر اس کی جانب مڑی۔ "مس شانتی ٹھاکر! آج سے تم اس اپارٹمنٹ کی مالک ہو۔ اب تم یہیں رہائش رکھو گی۔"

یہ بات بانو کے لیے قطعی غیر متوقع تھی' لہٰذا جلدی سے کہنے لگی۔ "مگر میرا سارا سامان تو ہوٹل میں پڑا ہے۔" شوبھا نے اپنائیت سے کہا۔ "مس ٹھاکر! تم اس کی چنتا نہ کرو۔ تمہارا سامان بھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا اور ہوٹل بل وغیرہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔ یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ ساتھ والے کمرے کو تم ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کر سکتی ہو جس کے ایک حصے کو ڈائننگ روم کے طور پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔

اس سے ملحقہ اپارٹمنٹ میرا ہے۔ اس طرح تمہیں بوریت نہیں ہو گی۔"

بانو کوئی جواب دیے بغیر ہوں ہاں پر اکتفا کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں البتہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی انجانے جال میں بری طرح پھنس کر رہ گئی ہے اور یہاں سے اب اسے کوئی معجزہ ہی نکال سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ خواہ مخواہ بہادری جتانے کے چکر میں یوں پھنس گئی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں مراد وغیرہ کے ساتھ رابطہ کرنا بھی تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ شوبھا پنڈت کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہی پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ "فی الحال تم میرے ساتھ آؤ کیونکہ مسٹر گپتا نے تمہیں یاد کیا ہے۔" چند لمحوں بعد وہ بانو سے مخاطب ہوئی۔ "میں تمہیں آپ کی بجائے تم سے مخاطب کر رہی ہوں کہیں تم نے اس بے تکلفی کا برا تو نہیں منایا۔ اصل میں تم عمر میں مجھ سے خاصی چھوٹی ہو۔ ویسے بھی جانے کیوں تم سے کچھ اپنایت سی محسوس ہو رہی ہے لہٰذا........"

بانو نے اسے یقین دلایا کہ اس نے شوبھا کی بے تکلفی کا برا نہیں منایا تو شوبھا خوشدلی سے کہنے لگی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم مائنڈ نہیں کرو گی۔ بہرحال آؤ گپتا جی سے مل لیں۔" کچھ دیر بعد وہ دونوں گپتا جی کے کمرے میں موجود تھیں۔ بانو نے رسمی طریقے سے اسے پرنام کیا اور خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

گپتا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "مس ٹھاکر! خیریت تو ہے' آپ کچھ گھبرائی سی محسوس ہو رہی ہیں۔" بانو نے صورتِ حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے خود کو سنبھالا دینے کی کوشش کی کیونکہ وہ اوکھلی میں سر دینے کے بعد مصائب سے گھبرانا لاحاصل تھا۔

"نہیں گپتا جی! گھبراہٹ کی تو خیر کوئی بات نہیں' البتہ نئے ماحول میں ایک اجنبیت کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔ وقت کے ساتھ یہ چیز بھی دور ہو جائے گی۔ ویسے بھی خاصے کمزور اعصاب کی مالک ہوں۔"

گپتا تسلی دینے والے انداز میں گویا ہوا۔ "ہاں وقتی طور پر ایسا محسوس ہو گا ہی' مگر

مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کریں گی۔ بہرحال میری طرف سے مبارکباد وصول کریں کہ آپ کی درخواست پر آپ کو گروہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ البتہ باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے میں کچھ دیر لگے گی کیونکہ چند ضابطے کی کارروائیاں ابھی باقی ہیں۔ آپ اب کسی قسم کی فکر نہ کریں کیونکہ اب آپ کے تمام مسائل کے حل کی ذمے داری ہماری تنظیم کی ہے۔"

بانو نیاز مندانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "شریمان جی! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے تنظیم میں شمولیت کی میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ یہ سب آپ کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ویسے میں آپ کو وشواس دلاتی ہوں کہ آپ کو اس فیصلے پر کبھی پچھتانا نہیں ہو گا۔ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ گروہ کی خدمت کروں گی۔"

گپتا شفقت آمیز لہجے میں بولا۔ "آج تو آپ اپنے اپارٹمنٹ میں جا کر آرام کریں۔ کل سے آپ کی باقاعدہ کلاسز شروع ہو جائیں گی جن کے ذریعے آپ کے ذہن کی تمام کثافتیں چند روز میں دور ہو جائیں گی۔" پھر وہ شوبھا کی طرف متوجہ ہوا۔ "شوبھا جی! انہیں واپس لے جائیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھیں اور ہاں مس ٹھاکر! آپ اگر کوئی دقت محسوس کریں تو فوراً شوبھا جی کے ذریعے مجھے بتائیں۔"

بانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "شریمان جی! اگر میں ہوٹل ہی میں رہوں اور روزانہ یہاں آ جایا کروں تو اس میں کیا قباحت ہے؟" گپتا کی آواز میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔ "نہیں مس ٹھاکر! ایسا ہونا ناممکن ہے۔ چند روز پہلے آشا نامی لڑکی نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس واقعہ کے بعد اصول و ضوابط پر بڑی سختی سے عمل شروع کر دیا گیا ہے' بہرحال اس وقت مجھے کہیں جانا ہے لہٰذا........" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

بانو سمجھ گئی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے' لہٰذا خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ واپس پہنچی تو اس کا سارا سامان ہوٹل سے لایا جا چکا تھا۔ اپنے کپڑے اٹیچی سے نکال کر الماری میں رکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ جیتے جی جانے اسے قفس سے اسے

چھٹکارا ابھی مل پائے گا یا نہیں۔

☆======☆======☆

مراد اور راجیو اس وقت گاندھی نگر والے مکان میں بیٹھے بانو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ اچانک ہوٹل چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی اور یہ بات ان کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی اگرچہ انہیں علم تھا کہ وہ گروہ کے ہی کسی ٹھکانے پر ہو گی مگر اس کے باوجود اس بات کا امکان تھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہو اور وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہو۔ اس سوچ نے مراد کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اسی دوران وہاں آشا بھی آگئی۔ وہ آتے ہی جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نے بھی اپنے طور پر شانتی دیدی کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ مجھے آپ دونوں پر بھی حیرت ہے کہ ابھی تک آپ زبانی جمع خرچ میں مصروف ہیں اور عملی طور پر کچھ بھی نہیں کر پائے۔“

وہ دونوں اس کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کیونکہ بظاہر وہ جو کچھ کہہ رہی تھی سو فیصد درست تھا۔ راجیو کچھ خفیف سا ہو کر کہنے لگا۔ ”ہم بھی تو فارغ نہیں بیٹھے۔ ہم نے کرنل بھوانی سنگھ سے بھی بات کر لی ہے۔ تم دیکھنا ہم جلدی اپنا کام شروع کر دیں گے۔“

آشا کے لہجے میں جھنجلاہٹ بدستور موجود تھی۔ ”بھاڑ میں جائے بھوانی سنگھ بھی اور تم بھی۔ اس سے بات کرنے کا نتیجہ آخر کیا نکلا۔ یہی نہ کہ شانتی دیدی غائب کر دی گئی۔ اس روز تم بڑیں ہانک رہے تھے کہ ہم بہت جلد اخباری مہم چلا کر پوتر پاپی گروہ کو بے نقاب کر دیں گے، مگر اس جانب تم نے ذرا سی بھی پیش رفت نہیں کی۔“

مراد نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”آشا جی! آپ کہہ تو صحیح رہی ہیں مگر ہم ذرا سازگار حالات کا انتظار کر رہے ہیں۔ اصل میں چند روز پہلے لوک سبھا ٹوٹی ہے، لہٰذا تمام اخبارات اسی حوالے سے خبروں کو اہمیت دے رہے ہیں۔ اخبار کا عام قاری بھی وہی

خبریں دلچسپی سے پڑھ رہا ہے۔ ویسے بھی یہ اتنا بڑا واقعہ ہے جس نے وقتی طور پر اخبارات کے تمام صفحات کو گھیر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کی گرد ذرا سی بیٹھ جائے تو اپنا کام شروع کر دیں۔“

آشا آج طنز کے سارے تیر چلا دینا چاہتی تھی۔ ”مسٹر ارجن شرما! شاید آپ کو برا لگے مگر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ اور راجیو نرے گفتار کے غازی ہیں۔ آپ لوگ سہاروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر جھک مار رہے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ کسی قسم کا رسک لیے بغیر ہی سارے معاملات خود بخود حل ہو جائیں، ورنہ ایسا کون سا کام ہے جو کوشش اور ہمت سے نہیں ہو سکتا۔“

مراد کو اس کی کھری باتوں پر تاؤ تو بہت آرہا تھا، مگر باتیں سچ تھیں لہٰذا خاموش رہا۔ راجیو البتہ اپنی اس قدر توہین برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لہٰذا تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ ”آشا پلیز! ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“

آشا درمیان ہی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔ ”نہیں مسٹر راجیو! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ نہ تو بزدلی کی کوئی حد ہوتی ہے اور نہ دلیری کی۔ آپ خود پر ہی نگاہ ڈالیں تو آپ کو لگے گا کہ بزدلی کی تمام حدیں پھلانگنے کے باوجود آپ کسی مزید سہارے کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔“

یہ اتنی بڑی گالی تھی جس نے مراد اور راجیو کو اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ وہ آشا سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت خود میں نہیں پا رہے تھے، مگر آج آشا جانے کس موڈ میں تھی۔ خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔ ”آپ دونوں کی طرف سے مکمل مایوس ہونے کے بعد میں نے کل اپنے طور پر کوشش شروع کر دی تھی۔ میں نے کئی اخبارات کے ایڈیٹروں سے رابطہ کیا اور ”پوتر اشنان“ کے حوالے سے انہیں اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ پہلے تو کسی ایڈیٹر نے بھی پاپیوں کے خوف سے اسے شائع کرنے کی ہامی نہ بھری، مگر جب میں نے انہیں سمجھایا کہ اس سٹوری کے شائع ہونے سے ان کے اخبارات کی

اشاعت کئی گنا بڑھ سکتی ہے کیونکہ عام قاری ایسی چٹخارے دار خبریں اور مضامین بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اصرار کیا کہ وہ میرا مکمل نام اور پتہ چھاپ سکتے ہیں تو جے پور کے دونوں بڑے اخبارات کے ایڈیٹر اسے فرنٹ پیج سٹوری کے طور پر شائع کرنے پر رضامند ہو گئے۔ میں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی پوری تفصیل ایک مضمون کی شکل میں انہیں فراہم کر دی ہے جو کل کی اشاعت میں یقیناً شائع ہو گی۔"

یہ سن کر مراد اور راجیو حیرت کے مارے گنگ سے رہ گئے تھے۔ راجیو کے حلق سے بمشکل نکلا۔ "آشا! یہ تم نے کیا کر دیا۔ تمہیں علم ہے اس کے نتائج تمہارے لیے کتنے سنگین ہوں گے۔" آشا کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔ "مسٹر راجیو! نتائج کی پروا تم جیسے دور اندیش اور سیانے لوگ کرتے ہیں۔ مجھ ایسے عام لوگوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے وہ تمام جیون عام آدمی ہی رہتے ہیں اور کسی روز گمنامی کی موت مارے جاتے ہیں' البتہ تم جیسے دانشوروں کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے۔"

راجیو اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "آشا پلیز! بھگوان کے واسطے ہمیں مزید زچ نہ کرو البتہ یہ بتاؤ کہ تمہاری اس طفلانہ حرکت سے پاپی گروہ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟" آشا کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "شریمان راجیو جی! مجھے اپنے بے گناہ باپ کی موت کا بدلہ لینا ہے اگر میں قاتلوں کا گریبان نہیں پکڑ سکتی تو کم از کم اتنا تو ضرور کر سکتی ہوں کہ ان کے چہروں پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب سرکا دوں' تاکہ کوئی دوسرا معصوم ان کی پاکبازی کے جھانسے میں آکر اپنی زندگی برباد نہ کر بیٹھے۔"

۳ ستمبر ۱۹۷۹ء کے اخبارات نے واقعی جے پور کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ "راجستھان پتریکا" اور "دینک نوجیوتی" دونوں اخباروں نے اپنے صفحہ اول پر "پوتر انسان کی کہانی آشا کی زبانی" کے عنوان سے خصوصی فیچر شائع کیے تھے جس میں آشا کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ عوام اور خواص نے اس کو کئی بار پڑھا تھا۔ اگرچہ ہر پڑھنے والے کا مقصد الگ الگ تھا۔ کچھ لوگوں نے محض چٹخارے حاصل کرنے کے لیے جبکہ

باقیوں نے اسے معاشرتی المیے کی نظر سے دیکھا تھا۔ اکثر لوگ اخبار پڑھنے کے بعد گروہ کی قیادت پر لعنت بھیج رہے تھے۔

☆======☆======☆

دوسری جانب گروہ کے کرتا دھرتاؤں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ گروہ کے قائد دیوی پرشاد ترپاٹھی نے ہنگامی میٹنگ میں اپنے سبھی نائبین کو بلا رکھا تھا اور سب کی کھینچاتانی جاری تھی۔ سبھی ایک دوسرے پر ذمے داری ڈال رہے تھے۔ کانفرنس ہال مچھلی منڈی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اچانک ترپاٹھی کی تیز آواز نے سبھی کو خاموش کر دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس صورتِ حال کا منطقی تجزیہ کرنے کے بجائے تم سب آپس میں الزام تراشی کر رہے ہو۔ ہماری ہوا اس اچانک واقعے سے جس طرح اکھڑی ہے اس کے تدارک کے طریقے سوچنے کے بجائے تم نے جوتیوں میں دال بانٹنا شروع کر دی ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے نائب اس قدر نکمے اور نااہل ہوں گے۔ اب ہماری بہتری اسی میں ہے کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے وہ لڑکی ہمارے قبضے میں ہو تاکہ آئندہ کسی کو ہمارے خلاف ہرزہ سرائی کی جرأت نہ ہو۔ ورنہ ایک بار یہ سلسلہ چل نکلا تو کہیں رکنے والا نہیں۔ میرے اس حکم کی اطلاع تمام کارکنوں کو دے دی جائے۔" یہ کہہ کر اس نے میٹنگ برخاست کر دی۔

☆======☆======☆

مراد اور راجیو کے سامنے آج کے اخبارات موجود تھے۔ راجستھان پتریکا اور دینک نوجیوتی میں شائع آشا کی سٹوری پر سبھی کی نظریں جمی تھیں۔ اس دوران وہاں آشا بھی آگئی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں پر اعتماد اور مسرت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

"دیکھا ارجن بابو! میں نہ کہتی تھی کہ انسان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

مراد کو آشا سے اتنے بڑے کام کی توقع نہ تھی۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "آشا! واقعی تم نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہو گا کہ نتائج بھی

ہماری منشا کے مطابق نکلتے ہیں یا نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد سیوا رام بھی آن دھمکا تھا۔ "ارے آشا دیوی! آج تو سارے شہر میں تمہارے ہی چرچے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی پیرائے میں تمہارا ذکر کر رہا ہے۔"

آشا کی خوشی دیدنی تھی۔ بچگانہ انداز میں خوش ہوتے ہوئے گویا ہوئی۔ "تریا بھی اور اس کے ساتھی اپنا سر پیٹ رہے ہوں گے کیونکہ ان کی ساری ساکھ ایک ہی دن میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی ہے۔"

مراد کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ "آشا! اب تمہیں اپنی حفاظت کا خصوصی دھیان رکھنا ہو گا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ زخمی سانپ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم کچھ روز کے لیے گاندھی نگر شفٹ ہو جاؤ کیونکہ یہ تمہارے گھر سے نسبتاً زیادہ محفوظ ہے۔" راجیو نے بھی اسے اس بات کا مشورہ دیا تھا' مگر آج اس الھڑ لڑکی میں کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ "نہیں ارجن بابو! آپ اور راجیو کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی لڑائی خود لڑوں گی۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

راجیو اور مراد نے جب یہ دیکھا کہ وہ ان کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر مراد نے کہا۔ "اگر تم یہاں ہمارے پاس آنے کے لیے رضامند نہیں تو ایسا کرو کہ سیوا رام کو کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھو تاکہ تمہیں کچھ تقویت حاصل رہے۔" کچھ بحث مباحثے کے بعد آشا نے یہ تجویز مان لی تھی اور سیوا رام کا سائیکل رکشہ وہیں چھوڑ کر وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے گئی تھی۔

گھر پہنچتے ہی اسے لگا جیسے سارے شہر کے ٹیلی فون اس کی تلاش میں تھے۔ مختلف اخبارات و جرائد کے نمائندے اس سے تفصیلی انٹرویو کے لیے درخواست کر رہے تھے' مگر وہ سبھی کو ٹال رہی تھی۔ اس دوران اسے سی بی آئی کے ایس پی رام سروپ کا فون موصول ہوا۔ "مس آشا! آپ نے اپنے انٹرویو میں "پوتر پاپی سنگھٹن" کے خلاف جو

الزامات عائد کیے ہیں ان کی انکوائری کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے تاکہ ایسے گھناؤنے جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف قانون حرکت میں آ سکے۔"

آشا نے خوش دلی سے کہا۔ "آفیسر! میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔" ایس پی رام سروپ بولا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے ماتحت عملے کے ہمراہ آپ سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔ آپ مہربانی کر کے گھر پر ہی رہیں۔"

شام پانچ بجے کے قریب باہر بیل بجی تو سیوا رام نے دروازہ کھولا۔ سامنے دو افراد سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ وہ تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں انسپکٹر رام دھن ہوں اور یہ سب انسپکٹر دولت رام ہیں۔ ہمیں ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے کماری آشا جی کو آفس طلب کیا ہے۔"

سیوا رام نے اندر آ کر آشا کو بتایا تو وہ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی' مگر سیوا رام نے کہا۔ "آشا جی آپ اکیلی نہیں جائیں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔" انسپکٹر دھن مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔ چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" باہر کھڑی جیپ میں وہ سبھی سوار ہو گئے' مگر جیپ روانہ ہوتے ہی رام دھن اور دولت رام نے دونوں کی کنپٹیوں سے پستول لگا کر سرد آواز میں کہا۔ "اگر ذرا بھی حرکت کی تو اپنی موت کے خود ذمے دار ہو گے۔ خاموشی سے چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

یہ صورتِ حال دیکھ کر سیوا رام کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے' مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد جیپ پاپی گروہ کے مقامی ہیڈکوارٹر میں داخل ہو رہی تھی جہاں گھسیٹ کر دونوں کو اتارا گیا اور انہیں الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت آشا کو مراد اور راجیو کا مشورہ یاد آ رہا تھا جسے اس نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا' ورنہ شاید وہ موجودہ صورتِ حال سے بچ جاتی۔

☆======☆======☆

شوبھا پنڈت اب بانو کے ساتھ تقریباً چمٹ کر رہ گئی تھی۔ ویسے وہ بڑی شائستہ اور سلجھی ہوئی عورت تھی۔ وہ صبح شام اسے رامائن، گیتا اور مہابھارت کے ایسے اشلوک ذہن نشین کراتی رہتی جن سے ہندو دھرم کی آفاقیت کا اظہار ہوتا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتی کہ بنی نوع انسان کے تمام مصائب کا حل اس پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ اس کا انداز بڑا دلنشین تھا جو سننے والے پر گراں نہیں گزرتا تھا۔

وہ اسے ہر دم یہ خوشخبری سناتی کہ بہت جلد اسے "سوامی راما نند تیرتھ" کے درشنوں کی سعادت بھی حاصل ہو جائے گی جو اسے جیون کو کامیاب بنانے کا گر بتائیں گے جس کے بعد اس کی آتما کو مکمل شانتی حاصل ہو جائے گی۔ سوامی جی کا تذکرہ بانو اتنی بار سن چکی تھی کہ خود اسے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔

منگل کے روز شوبھا علی الصبح ہی نازل ہو گئی تھی اور اس کے سامنے سوامی جی کی تعریفوں کے پل باندھنے کے بعد کہنے لگی۔ "تم دوپہر تک پوتر اشنان کر کے یہ کپڑے پہن لینا کیونکہ سوامی جی کے حضور وہی لوگ حاضری دے سکتے ہیں جن کی آتما اور شریر (روح اور جسم) تمام دنیاوی آلائشوں سے پاک ہوں۔ یہ کپڑے خاص طور پر گنگا جل سے دھلے ہوئے ہیں اس کے علاوہ تم جس پانی سے اشنان کرو گی وہ بھی خاص طور پر "ہردوار" سے لایا گیا ہے۔ اس کی ایک ایک بوند پوتر ہے۔ اس اشنان کے بعد تمہیں لگے گا کہ تمہارا صرف نام ہی شانتی نہیں بلکہ سکون و شانتی تمہاری روح تک میں سرایت کر گئی ہے۔"

بانو کو سارے گورکھ دھندے کا پہلے سے پتہ تھا اور وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھی، مگر شوبھا کی چرب زبانی پر اسے بہت تاؤ آ رہا تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔ اسی دوپہر اس نے پوتر اشنان بھی کر لیا تھا اور سوامی راما نند تیرتھ کے درشن بھی کر لیے تھے جو شکل ہی سے فراڈ لگ رہا تھا۔ ان دونوں مراحل سے گزرنے کے بعد اسے گروہ کی باقاعدہ رکنیت حاصل ہو گئی تھی اور اب اسے عمارت میں گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل ہو گئی تھی۔

اس قلعے میں ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی جہاں تفریح کے لیے سینما ہاؤس سے لے کر مطالعے کے لیے شاندار لائبریری بھی موجود تھی۔ البتہ شوبھا ہر دم اس کے ساتھ لگی رہتی۔ اسے اپنے اس دم چھلے سے چڑ سی ہو گئی تھی مگر مجبوراً اسے برداشت کر رہی تھی وہ کھانا زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں کھاتی اگرچہ قلعے میں ایک شاندار میس بھی تھا۔

اس روز اس نے رات کا کھانا میس میں کھانے کا ارادہ کیا۔ حسب معمول شوبھا اس کے ساتھ تھی۔ بانو اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جہاندیدہ عورت کسی اپنایت کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جڑی ہوئی بلکہ اس کی نگرانی پر مامور ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بانو نے شوبھا کو مخاطب کیا۔ "دیدی! تھوڑا گھومنے کو جی چاہ رہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو............"

شوبھا اس پر صدقے واری ہوتے ہوئے بولی۔ "ہاں ہاں چلو ہم اوپر چھت پر کچھ دیر چہل قدمی کر لیتے ہیں۔" پر پیچ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ قلعے کی چھت پر پہنچیں۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے کھلی چھت پر گھومنا بانو کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دور نشیب میں جے پور شہر کی روشنیاں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ چھت پر جانے سے بانو کا مقصد محض تفریح نہیں تھا بلکہ وہ اس عمارت اور گرد و نواح کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتی تھی۔

قلعے کی چھت کے مشرقی جانب دس فٹ اونچی دیوار سے چھت کو دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ چھت کا زیادہ بڑا حصہ تو وہی تھا جہاں وہ گھوم پھر رہی تھیں البتہ تقریباً چھت کے ایک چوتھائی حصے کو دیوار کے ذریعے الگ کر دیا گیا تھا۔ دیوار کے ایک کونے میں سات فٹ طول و عرض کا سلاخوں والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں میں سے چھت کا دوسرا حصہ بھی صاف نظر آ رہا تھا جو چند کمروں کی عمارت پر مشتمل تھا۔

بانو دروازے کے اس پار دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "دیدی! دیوار کے اس پار والی عمارت میں کیا ہے۔ کیوں نہ ادھر کا بھی چکر لگا آئیں؟" شوبھا چند لمحے سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ "شانتی! بھگوان نہ کرے ہم ادھر جائیں۔" بانو یہ سن کر حیران سی ہو گئی تھی۔

"کیوں دیدی! ادھر ایسی کون سی بات ہے جو آپ یوں گھبرا سی گئی ہیں۔"

شوبھا کے لہجے میں ہلکی سے کپکپاہٹ تھی۔ "شانتی ٹھاکر! کوئی دوسری بات کرو۔ ادھر جانے والے لوٹ کر واپس نہیں آتے اور اگر آ بھی جائیں تو ان کا جیون موت سے بدتر ہو جاتا ہے۔" بانو کچھ چڑتے ہوئے بولی۔ "شوبھا جی! آپ معمولی سی بات کو پُراسرار بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بھلا ایسی بھی کیا بات ہوئی کہ چند گز ادھر والی عمارت میں جانے والے واپس نہیں آتے۔ کیا وہاں کسی آسیب کا سایہ ہے؟"

شوبھا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "مس ٹھاکر! تم خواہ مخواہ اصرار کر رہی ہو تو سنو وہ عمارت کسی بھوت نگر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہاں سب لوگ اس جگہ کو "نرک" (دوزخ) کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں کا ماحول وہی ہے جو رامائن اور گیتا کے مطابق نرک کا ہے۔" بانو نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "شوبھا جی! مجھے تو آپ کی بات بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔ پتہ نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

شوبھا کچھ جھنجلا سی گئی تھی۔ "صاف لفظوں میں سننا چاہتی ہو تو سنو۔ وہ ایک ٹارچر سیل اور ایسی عقوبت گاہ ہے جس کے تصور سے ہی جھرجھری آ جاتی ہے۔ گروہ کے مخالفین اور غداروں کو وہاں رکھا جاتا ہے جہاں دنیا بھر کی دہشت کے سبھی سامان موجود ہیں۔"

بانو بھی پوری طرح انکوائری کے موڈ میں تھی۔ "کیا آپ اس جگہ کو دیکھ چکی ہیں۔" شوبھا اس پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "ہاں میں اسے دیکھ چکی ہوں بلکہ گروہ کے ہر رکن کو ایک بار وہاں کا درشن ضرور کرایا جاتا ہے تاکہ کسی کے ذہن میں کبھی بغاوت یا غداری کا خیال تک نہ آئے۔ تمہاری خواہش ہے تو ابھی تمہیں بھی دکھا دیتی ہوں۔ تم چند منٹ یہاں ٹھہرو میں گپتا جی سے چابی اور اجازت لے کر آتی ہوں۔"

بانو کے جواب کے انتظار کے بغیر وہ نیچے اتر گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھامے وہ واپس آئی اور درمیانی دروازہ کھول دیا۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر

واقعی چھوٹی سی عمارت تک وہ دونوں پہنچیں۔ عمارت کے چاروں جانب لوہے کی مضبوط جالیاں لگی تھیں۔ اینٹ یا پتھر کی دیوار نہ تھی۔ ان جالیوں کی اندرونی جانب شفاف شیشے کی دیواریں تھیں۔ بانو نے جالی کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر دیکھا تو خوف کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گئی۔

اندر کمرے میں تیز روشنی کا بندوبست تھا جس کی وجہ سے ہر چیز صاف واضح نظر آ رہی تھی اس چھوٹی سی عمارت کو شیشے کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں سے کئی حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ ہر کیبن میں مختلف قسم کے حشرات الارض شیشے کے فرش اور دیواروں کے ساتھ آزادانہ رینگ رہے تھے۔ ان میں بڑے اژدہوں سے لے کر چھوٹے چمکیلے سانپ تک سبھی موجود تھے جو اپنی پتلی یا سرخ زبانوں سے شیشے کی دیواروں کو چاٹ رہے تھے۔ ایک کیبن میں مکروہ شکل کی چھپکلیاں تھیں جبکہ دوسری جانب موٹے چوہے اور بچھو ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ چھوٹی بڑی چیونٹیوں سے لے کر سانپ اور بچھو اندر آزادانہ گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی کراہت اور دہشت کا عجب سا احساس ہوتا تھا۔

بانو گھوم کر دوسری جانب شیشے کی دیوار تک پہنچی تو اندر جھانکتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی کیونکہ سامنے ہی دو مختلف کیبنوں میں ایک مرد اور عورت بند تھے۔ وہ اپنے کیبن کے فرش پر بیٹھے بے بسی سے اپنے چاروں جانب گھومنے والے حشرات الارض کو تک رہے تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں خوف اور دہشت کے مارے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بالکل بے حس و حرکت تھے جس سے گمان گزرتا تھا کہ شاید ان کی ارواح جسموں کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔

خود بانو کی حالت ایک لمحے میں ہی زندہ لاش جیسی ہو گئی تھی کیونکہ اس نے آشا اور سیوا رام کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اسے یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب لگ رہا تھا۔

بانو کی دہشت ناک چیخ عمارت کے نچلے حصے تک پہنچی تھی۔ نیچے سے کئی افراد

دوڑتے ہوئے اوپر آئے۔ ان میں گپتا جی بھی شامل تھے۔ باقی لوگ تو کچھ دور ہی رک گئے' البتہ گپتاجی تیز قدموں سے بانو اور شوبھا کی جانب آگے بڑھے۔ قریب پہنچ کر وہ غالباً صورتِ حال کو بھانپ گئے تھے اس لیے ان کے قدموں کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔ نزدیک آکر بولے۔ "کیا بات ہے شوبھا! یہ چیخنے کی آواز کس کی تھی؟" شوبھا نے معنی خیز نگاہیں بانو پر ڈالیں۔ "گپتاجی! کوئی خاص بات نہیں' شانتی جی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔"

گپتا کے لہجے میں نرمی تھی۔ "مس ٹھاکر! اس میں گھبرانے والی کون سی بات ہے جو آپ یوں چلانے لگیں۔" بانو کے اعصاب ابھی تک نارمل نہیں ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں ابھی تک آشا اور سیوا رام پر جمی تھیں۔ "مہاراج! یہ عورت اور مرد کون ہیں اور انہیں یہاں کیوں بند کیا گیا ہے۔ یہ لوگ زندہ بھی ہیں یا.........." یہ کہہ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

گپتا ساری بات سمجھ گیا تھا' اور اس کی آواز میں شگفتگی کی جھلک نمایاں تھی۔ "شانتی جی! آپ نے تو ایک ہی سانس میں بہت سارے سوال کر ڈالے۔ لگتا ہے آپ خاصی کمزور اعصاب کی مالک ہیں۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" بانو کی آواز ابھی تک لرز رہی تھی۔ "مگر یہ ہیں کون لوگ اور کیا وہ مرچکے ہیں؟" گپتا اس کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "شانتی دیوی! آپ ان لوگوں کی چنتا نہ کریں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایسے ڈھیٹ لوگ یوں جلدی سے مرنے والے نہیں اور یوں بھی میں انہیں اتنی آسانی سے مرنے بھی نہیں دوں گا۔ کسی کو ایک دم جان سے مار دینا بھی کوئی سزا ہے۔ ابھی تو ہلکی سی سرزنش کی گئی ہے۔"

پھر وہ شوبھا کی جانب مڑا۔ "شوبھا! نیچے سے بجرنگ کو بلا کر کہو کہ ان دونوں کو نکال کر نیچے لے جائے اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ لگتا ہے خوف سے بے ہوش ہوگئے ہیں اور ہاں اسے یہ بھی کہنا کہ فی الحال ان دونوں کے آرام اور خوراک کا

بھی دھیان رکھے۔ ان سے سب کچھ اگلوائے بغیر انہیں مرنے دینا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ شوبھا حکم کی تعمیل کے لیے نیچے چلی گئی' مگر بانو کی نگاہوں کا مرکز ابھی تک وہی دونوں تھے۔ وہ گپتا کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ "شریمان جی! اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی بتادیں کہ ان دونوں سے کون سا اپرادھ (جرم) سرزد ہوا ہے؟"

گپتا مہاراج نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا اور بانو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "ارے بھئی! تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ یہاں رہوگی تو دھیرے دھیرے ساری صورتِ حال سے باخبر ہوجاؤ گی۔ ویسے تم بضد ہو تو میں بتا دیتا ہوں کہ انہیں گروہ سے غداری کی سزا ملی ہے۔" بانو نے اپنی سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔ "مہاراج! ابھی تک میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ ذرا کھل کر بتائیں تو شاید سمجھ میں آجائے۔"

اس نے عجیب سے انداز میں بانو کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی شیطانیت دیکھ کر بانو کسی قدر گھبرا سی گئی تھی۔ گپتا کا لہجہ سرسری سا تھا۔ "شانتی! ان بکھیڑوں میں پڑ کر اپنی توانائی مت ضائع کرو۔ کہہ جو دیا یہ ہمارے غدار ہیں۔ یہ لڑکی جسے تم بڑی معصوم سمجھ رہی ہو' یہ پہلے ہمارے گروہ کی رکن تھی' پھر اس کے ذہن میں ہیرو بننے کا خیال آیا اور یہاں سے بھاگ نکلی۔" بانو کچھ اور پریشان سی ہوگئی۔ "تو کیا اس کا جرم یہی ہے کہ یہاں سے بھاگ نکلی تھی؟" گپتا نے مزید وضاحت کی۔ "نہیں اس کا جرم بہت بڑا ہے۔ اس حرامزادی نے جانے کس کی شہ پر کل کے اخبار میں ہماری تنظیم پر کیچڑ اچھالا ہے۔ خصوصاً پوتر اشنان کے حوالے سے اس نے بہت جھوٹ بکا ہے۔ تم خود ہی بتاؤ پوتر اشنان میں تمہیں کوئی برائی محسوس ہوئی۔ یہ اشنان تو تن اور من دونوں کو پاکیزگی مہیا کرتا ہے۔"

یہ سن کر بانو کی تیوریوں کے بل گہرے ہوگئے مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ گپتا نے اپنی بات مزید آگے بڑھائی۔ "ویسے اچھا ہی ہوا تم نے آج یہ منظر دیکھ لیا۔ گروہ میں ہر

نئے شامل ہونے والے کو اس قسم کا منظر ضرور دکھایا جاتا ہے تاکہ آگے چل کر اس کے دماغ میں کوئی خناس نہ آنے پائے' ویسے تم سے مجھے یہ امید نہیں۔"

بانو جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس دوران بجرنگ تین ساتھیوں سمیت دو اسٹریچر لے کر آگیا۔ ان چاروں نے دوسری جانب سے کمرے کا دروازہ کھولا اور آشا اور سیوا رام کو اسٹریچر پر ڈال کر نیچے لے گئے۔ بانو ان دونوں کو نیچے لے جاتے دیکھ کر بہت دکھی ہوئی کیونکہ اس نے چند روز ان کے ہمراہ اچھے دوستوں کی طرح گزارے تھے۔ ان کے جانے کے بعد گپتا' بانو کی جانب متوجہ ہوا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم نیچے جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو تاکہ تمہارے اعصاب کو سکون مل سکے۔" بانو اس کے مشورے میں پوشیدہ حکم کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی' لہٰذا بوجھل قدموں سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب چلنے لگی۔

اپنے کمرے میں جا کر وہ اوندھے منہ بستر پر گر پڑی اور اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ وہ درحقیقت بہت خوفزدہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں آکر وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور آہستہ قدموں سے شوبھا اس کی طرف بڑھی اور نرم لہجے میں بولی۔ "شانتی! یوں اپنا من چھوٹا نہ کرو' تم نے اپنے لیے جس راہ کا انتخاب کیا ہے' اس میں تو ایسے مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔"

بانو سر اٹھا کر خاصی دیر خاموش نگاہوں سے شوبھا کو دیکھتی رہی' پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ "شوبھا دیدی! کیا آپ واقعی اتنی سخت دل ہیں کہ اس قسم کے غیرانسانی ظلم ہوتے دیکھ کر آپ کو دکھ محسوس نہیں ہوتا۔" شوبھا اپنے قدرے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتے ہوئے اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ "شانتی! پلیز آئندہ سے تم مجھے دیدی مت کہا کرو کیونکہ ایسے شبد مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

بانو قدرے حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ "مگر شوبھا جی! یہ لفظ اتنا برا تو نہیں جو آپ

ناراض ہوگئی ہیں۔" شوبھا کے لہجے میں عجیب سی کڑواہٹ تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ لفظ برا نہیں مگر مجھے ہر طرح کے رشتے ناطوں سے نفرت ہوگئی ہے اور میں ان پر یقین نہیں رکھتی۔"

وہ اپنی پریشانی بھول کر ایک عجیب سے تجسس میں مبتلا ہوگئی تھی۔ "شوبھا دیدی! لگتا ہے کہ آپ بھی اندر سے بری طرح ٹوٹ چکی ہیں اور اپنے اندر طوفان چھپائے بیٹھی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ سنا ہے اس طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

شوبھا کچھ دیر اپنی ساڑھی کے پلو سے کھیلتی رہی اور جواب میں کچھ نہ بولی۔ پھر اٹھی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد بانو کے سامنے صوفے کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ بانو اس کی آنکھوں میں اترتی ہوئی نمی سے باخبر تھی' مگر وہ خاموشی سے اس کے بولنے کے انتظار میں رہی۔ کمرے میں خاصی دیر تک سوگوار سناٹا طاری رہا۔ اس خاموشی کو شوبھا کی مدھم آواز ہی نے ختم کیا۔

"میں اودھے پور کے ایک متوسط برہمن گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد۔ برادری کی روایت سے ہٹ کر انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی رہی۔ "ہندو متھالوجی" میں ماسٹرز کرنے کے بعد مجھے راجستھان یونیورسٹی میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ میرے خیالات شروع ہی سے دھارمک (مذہبی) تھے اور میں زمانہ طالب علمی ہی سے "آر ایس ایس" سے بہت متاثر تھی اور اس کے سٹوڈنٹس ونگ میں نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد مجھے ملازمت مل گئی۔ یونیورسٹی میں پڑھاتے مجھے سات سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے باپا نے بہت زور لگایا کہ میں شادی کرلوں مگر میرے ذہن پر ہندو جاتی (قوم) کی بہتری کا بھوت سوار تھا۔ اپنا سارا جیون اس مقصد کے لئے وقف کردینا چاہتی تھی' انہی دنوں میری کلاس میں ایم اے کے پہلے سال میں ایک طالب علم پربھودیال

داخل ہوا۔ واجبی سی شکل کے اس نوجوان میں جانے کیا بات تھی کہ میں پہلے ہی روز سے اس سے متاثر ہوگئی۔ بہت غریب گھرانے کا ہونے کے باوجود کلاس میں نمایاں رہتا۔ اس کا باپ جے پور کے ہنومان مندر میں معمولی سا پجاری تھا۔

"وہ عمر میں مجھ سے تقریباً دس برس چھوٹا تھا۔ عمر کے اس تفاوت کے باوجود میں اس کی جانب کھنچی چلی گئی۔ دھیرے دھیرے وہ بھی میری جانب مائل ہونے لگا۔ ایم اے کے امتحان کے فوراً بعد ہم دونوں نے شادی کرلی اور وہ میرے ہی گھر میں رہنے لگا۔ میں نے اپنی ملازمت کے دوران شاستری نگر میں خاصا خوبصورت مکان بنا لیا تھا۔ شادی کے بعد اس کا پروہت باپ بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ میرے پتی پربھودیال اور اس کے باپ وشنو دیال نے میرے ماں باپ کو صلاح دی کہ اب ان دونوں کو دنیا داری چھوڑ کر کاشی ہردوار اور جگن ناتھ کی یاترا کرلینی چاہیے۔ میرے ماتا پتا "تیرتھ یاترا" مقدس مقامات کی زیارت کو ایسے نکلے کہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

"میرے پتی اور سسر کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا' لیکن میرے ماں باپ کے تیرتھ یاترا جانے کے بعد ان کے سلوک میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ دونوں بار بار مجھے زیادہ عمر ہونے کا احساس دلاتے۔ ایک بار میرے پتی پربھودیال نے صاف لفظوں میں کہہ بھی دیا کہ میں اس کے قابل نہیں کیونکہ میں تو اس کی ماں لگتی ہوں۔ یہ سن کر مجھ پر ایک قیامت سی گزر گئی۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں باپ بیٹے نے مجھ پر زور دیا کہ میں ملازمت چھوڑ دوں' انہیں میرے چال چلن پر شبہ ہے۔ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد مجھے گھر میں عملاً قید کردیا گیا۔ اس کے بعد پربھودیال کے باپ وشنو دیال نے بھی زبردستی میرے ساتھ تعلقات قائم کرلئے اور یہ سب کچھ میرے پتی کے علم میں تھا۔ یوں میں "دیشیاؤں" سے بدتر زندگی گزارنے لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کسی حد تک اس صورتِ حال سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ اسی دوران یہ حادثہ پیش آیا کہ میں نے چھپ کر ان دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو سن لی۔ وہ مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اگلی ہی

صبح میں نے پہل کرنے کا فیصلہ کیا اور ناشتے میں زہر ملا کر دونوں کو کھلا دیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ دونوں "نرک سدھار" (جہنم رسید) گئے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ اس دوہرے قتل کا سیدھا الزام مجھ پر آئے گا' چنانچہ میں نے "پوتر پاپی" گروہ سے رابطہ قائم کیا اور اپنی ساری کہانی سنا کر ان سے مدد کی درخواست کی۔ یوں میں ان کی پناہ میں چلی آئی۔ تب سے میں گروہ کی تمام کارروائیوں میں بھرپور حصہ لے رہی ہوں۔ گروہ میں شامل ہونے کے بعد پتہ چلا کہ اس تنظیم نے سماجی خدمات کا محض لبادہ اوڑھ رکھا ہے' اس کا اصل کام حکومت کے ان مخالفین کا تیا پانچہ کرنا ہے جن کے خلاف حکومت رائے عامہ کے خوف سے کوئی قانونی ایکشن نہیں لے سکتی۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ممالک خصوصاً پاکستان میں اس تنظیم کی کارروائیوں میں میری مدد شامل ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر شوبھا خاموش ہوگئی۔ اس کی طویل کہانی کے دوران بانو نے کوئی مداخلت نہیں کی اور پورے انہماک سے اس کی جانب متوجہ رہی' مگر گفتگو کے آخری حصے نے اسے چونکا دیا۔ "شوبھا دیدی! آپ کی داستان واقعی المناک ہے' مگر کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں' مثلاً آپ کے بقول یہ تنظیم پاکستان کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے' بھلا اس گروہ کو پاکستان سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔"

اس کی بات سن کر شوبھا خلافِ توقع ہنس پڑی۔ "ارے شانتی! تمہیں علم ہونا چاہئے کہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی عورت دشمن دیش کو کتنا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں خود آج تک کبھی پاکستان نہیں گئی' مگر وہاں دہشت گردی کی کارروائیوں کے سرخیل اکثر و بیشتر یہاں آتے رہتے ہیں اور ان کی "خاطر تواضع" میری ہی ذمے داری ہے۔ سیوا کے دوران میں انتہائی مہارت سے ان کے ذہنوں میں پاکستان مخالف جذبات کو مزید پختہ کرتی ہوں۔ میرے علاوہ بھی کئی دوسری ہندو خواتین اس شبھ کام کا ایک حصہ ہیں۔"

بانو کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شوبھا سے مخاطب ہوئی۔ "شوبھا جی! آپ کی بات

چیت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی موجودہ حیثیت سے پوری طرح مطمئن ہیں۔" شوبھا کا لہجہ یک لخت اکھڑ سا گیا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے دھرم اور دیش کی خدمت کر رہی ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔"

☆==========☆========☆

مراد اور راجیو کو آشا اور سیوا رام کی اچانک گمشدگی نے ہراساں کر دیا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ ایک ریسٹورنٹ کے نسبتاً ویران گوشے میں بیٹھے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ "مسٹر شرما! آپ ہی کچھ بتائیں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اب تک آپ کے مشورے بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔" مراد خلا میں نظریں جمائے یوں لاتعلقی سے بیٹھا تھا جیسے اس نے راجیو کی بات سنی ہی نہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا اور اس نے آہستگی سے کہا۔ "راجیو! یہ بات طے ہے کہ انہیں پاپی گروہ ہی نے اغوا کیا ہے۔ دوسری جانب شانتی سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہو سکا اور شاید ہم دونوں اس پوزیشن میں نہیں کہ تن تنہا اس گروہ سے ٹکرا کر اپنے ساتھیوں کو رہا کرا سکیں۔"

راجیو دھیمی سی آواز میں بڑبڑایا۔ "میں آپ سے متفق ہوں کہ ہم دونوں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' البتہ کرنل بھوانی سنگھ کی مدد سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔" مراد نے پہلے کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے ہمیں ان سے مدد لینی ہوگی مگر اس کے عوض وہ بھی یقیناً چاہیں گے کہ انتخابی مہم میں ہم ان کے لئے کوئی ٹھوس کام کر سکیں۔ محض زبانی جمع خرچ سے ہم ان کی عملی ہمدردی حاصل کرنے سے رہے۔ ہمیں پہلے کچھ کارکردگی دکھانی پڑے گی۔"

مراد اٹھتے ہوئے بولا۔ "آئیں میرے ساتھ۔" راجیو کے چہرے پر حیرانی کے آثار گہرے تھے وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب کہاں کا پروگرام ہے۔" راجیو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ خاموشی سے میرے ساتھ چلیں۔ ہم ابھی کرنل صاحب سے ملیں گے۔ اس مرحلے میں معمولی سی تاخیر بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم

دونوں ان کے ہتھے چڑھ جائیں اور میں اڑنے سے پہلے ہرگز گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔"

وہ کرنل بھوانی سنگھ کی رہائش گاہ راج نواس پہنچ گئے اور مسلسل ہارن کی آواز سن کر دربان نے اس قلعہ نما عمارت کا دروازہ کھولا اور راجیو گاڑی کو سیدھا پورچ میں لے گیا۔ انہیں چند لمحوں بعد ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا جہاں خلاف توقع کرنل بھوانی سنگھ اور ڈاکٹر چندر بھان پہلے سے ان کے منتظر تھے

رسمی سلام دعا کے بعد کرنل کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "اچھا ہوا تم لوگ خود آ گئے' کچھ دیر پہلے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ سگار سلگانے لگا۔ اب شاید ڈاکٹر چندر بھان کی باری تھی۔ "مسٹر شرما! اس روز تو آپ دونوں نے بڑے دعوے کئے تھے اور ہمیں بہت سبز باغ دکھائے تھے' مگر انتخابی شیڈول کے اعلان ہونے کے باوجود تم کچھ بھی نہیں کر سکے۔"

مراد کی آواز اعتماد سے بھرپور تھی۔ "ڈاکٹر! ہم اسی سلسلے میں خود حاضر ہوئے ہیں۔ کل صبح راجیو جی بھی جے پور سے لوک سبھا کی نشست کے لئے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرائیں گے۔" یہ سن کر کرنل' ڈاکٹر اور راجیو تقریباً اچھل پڑے۔ راجیو قدرے ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ "مسٹر ارجن شرما! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کرنل بھوانی سنگھ کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا سوچوں؟ کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟" مراد کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ "مسٹر راجیو! پہلے میری بات مکمل تو ہونے دیں۔ آپ کل صبح پریس کانفرنس کریں گے جس میں پوتر پاپی گروہ کے فارورڈ بلاک کی تشکیل کا اعلان کریں گے۔ آپ بتائیں گے کہ اس کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی بنا پر آپ کو فارورڈ بلاک بنانا پڑا تاکہ عوام اصل حقائق سے آگاہ ہو سکیں۔ آپ اپنے لئے "پوتر گروہ" کا نام استعمال کریں گے جبکہ ترپاٹھی گروپ کو "پاپی گروہ" کے نام سے پکاریں گے۔"

کرنل اور چندر بھان دخل دیئے بغیر ان کی باتیں پوری دلچسپی سے سن رہے تھے۔

مراد نے چائے کا کپ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ سبھی اخبارات تمہارے الزامات کو اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر اس گروہ نے ہمیں ختم کرنے کا پروگرام بنایا ہے تو کم از کم الیکشن ختم ہونے تک وہ اپنے اس ارادے سے باز رہے گا کیونکہ اس دوران تمہاری موت یا گمشدگی کا سیدھا الزام ان پر آئے گا اور موجودہ انتخابی فضا میں وہ لوگ یقیناً اس الزام کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس پوری صورتِ حال کا بالواسطہ فائدہ کرنل بھوانی سنگھ جی کو پہنچے گا۔"

اس کی بات مکمل ہوئی تو کرنل کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "راجیو! مسٹر ارجن شرما کی تجویز میں بڑا وزن ہے۔ تمہیں اس بات پر عمل کرنا چاہئے۔" ڈاکٹر چندربھان نے بھی تائید میں سرہلایا۔ وہ چاروں رات گئے تک صلاح مشوروں میں ہمہ تن مصروف رہے۔

اور اگلی سہ پہر ایک مقامی ہوٹل میں بلائی ہوئی پریس کانفرنس میں راجیو پورے دھڑلے سے ترپاٹھی گروپ پر الزامات کی بوچھاڑ کررہا تھا۔ اکثر صحافی دانتوں میں قلم دبائے سوچ رہے تھے کہ اس زبردست سٹوری کو اپنے اخباروں میں کس طرح نمایاں طور سے چھاپا جاسکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس پریس کانفرنس کی خبر پورے جے پور میں پھیل گئی۔ گروہ کے سرکردہ افراد نے اخبارات کے دفاتر فون کرکے اس کی اشاعت رکنے کی بھرپور کوشش کی، مگر وہ ناکام رہے۔ اگلے روز سبھی اخباروں نے خوب نمک مرچ لگا کر راجیو کے سارے الزامات شائع کر ڈالے جن سے جے پور کی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ یہ پریس کانفرنس ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے اخبارات میں چھپی تھی۔

جے پور کے نواح میں پوتر پاپی گروہ کے مقامی ہیڈ کوارٹر کا ماحول بڑا کشیدہ تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے کھچا کھچا سا نظر آرہا تھا۔ کانفرنس روم کی طویل میز کے گرد پندرہ افراد بیٹھے تھے جن کے سامنے آج کے اخبارات پڑے تھے۔

دائیں جانب درمیانی کرسی خالی تھی۔ کانفرنس روم کا دروازہ کھلا اور گروہ کا سربراہ دیوی پرشاد ترپاٹھی اندر داخل ہوا۔ وہ درمیانی قد و قامت کا بارعب شخص تھا جس کی عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ اسے دیکھ کر سبھی لوگ تعظیماً کھڑے ہوگئے تھے۔

ترپاٹھی کے بیٹھتے ہی میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ رسمی کارروائی کے بعد گپتا جی نے مختصر الفاظ میں حاضرین کو اس ہنگامی اجلاس کے ایجنڈے سے آگاہ کیا۔ "پچھلے چند ہفتوں سے کچھ حلقے بڑے منظم انداز سے تنظیم کو بدنام کرنے کی جو کوششیں کررہے ہیں، آپ ان سے بے خبر نہیں ہوں گے لہٰذا......" ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ ترپاٹھی نے مائیک اٹھا کر اپنے آگے کرلیا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "مسز گپتا! بند کرو اپنا یہ رسمی بکواس۔ اس قسم کی لفاظی سے تم اپنی غلطیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔"

گپتا کا چہرہ بھری محفل میں اپنی توہین کے احساس سے سرخ ہوگیا۔

ترپاٹھی نے گپتا کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا اندازہ لگالیا تھا اور وہ کسی قدر نرم آواز میں گویا ہوا۔ "آپ سبھی لوگ موجودہ صورتِ حال سے واقف ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر دوسری بار کھلے عام ہم پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ اس کے تدارک کا اگر فوری بندوبست نہ کیا گیا تو ہمارے لئے بہت سے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں اور ہماری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

گپتا کے برابر بیٹھا ہوا ایک لحیم شحیم شخص بولا۔ "مہاراج! ہم اس لڑکی آشا کو تو پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ اسے فوری طور پر موت کی نیند سلا کر کسی پبلک مقام پر پھینک دیا جائے تاکہ اس کے ہمدردوں کو احساس ہو جائے کہ وہ بھی اس انجام سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ راجیو نامی شخص کو بھی فوری طور پر ختم کرنے کے احکام صادر فرمائیں۔"

چند افراد اس کی باتوں پر تائید کے طور پر سرہلاتے رہے۔ ترپاٹھی نے کچھ دیر مزید خاموش رہنے کے بعد سبھی کے چہروں پر نظر دوڑائی۔ اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہاں تو مسٹر داس! تمہارے خیال میں مسئلے کا حل یہی ہے کہ فوری طور پر راجیو کو ختم کردیا جائے۔ ابے گدھے! مجھے اچھی طرح علم ہے کہ اس نے لوک سبھا الیکشن میں حصہ لینے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے۔ اسے قتل کردینے سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ الیکشن کا جائزہ لینے کے لیے آنے والے غیر ملکی مبصرین اور صحافی اس واقعے کو عجب عجب رنگ دیں گے اور ہم تک آ پہنچیں گے۔"

پھر وہ ایک دوسرے شخص سے مخاطب ہوا۔ "گپتا تم فوری طور پر راجیو اور اس کے ساتھیوں کے گرد گھیرا تنگ کردو۔ یہ پتہ فوری طور پر لگاؤ کہ راجیو کن لوگوں کی شہ پر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔"

گپتا کا لہجہ مؤدب تھا' اس نے کہا۔ "چیف! اس کے بڑے حامی کرنل بھوانی سنگھ اور ڈاکٹر چندر بھان ہیں اور ان کی وجہ سے "کانگرس آئی" کی مقامی قیادت ہمارے خلاف راجیو کے کندھے استعمال کر رہی ہے' آپ کے حکم کے مطابق آج سے ان لوگوں پر خصوصی نظر رکھی جائے گی۔" چند مزید تجاویز پر بحث کرنے کے بعد اجلاس ختم کردیا گیا۔

اسی شام گپتا نے بانو کو اپنے پاس طلب کیا۔ وہ حیران تھی کہ آج اس نے اسے اپنے آفس کے بجائے دوسرے کمرے میں بلایا ہے۔ کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے اسے نمسکار کیا۔ وہ کچھ دیر بانو کو دیکھنے کے بعد بولا۔ "مس شانتی ٹھاکر! میرا خیال ہے کہ آپ نے خاصا آرام کرلیا ہے۔ اب کچھ کام کی باتیں ہو جانی چاہئیں۔" بانو تو خود یہی چاہتی تھی۔

"جی ہاں! میں خود بھی فارغ رہ کر اکتا گئی ہوں۔"

"شانتی دیوی! آپ کو ایک شخص ڈاکٹر چندر بھان کا پورا اعتماد حاصل کرنا ہے۔"

بانو عام سے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے' آپ معلومات مہیا کیجیے' میری رہنمائی کرتے رہیے' میں یہ کام کرلوں گی۔" گپتا نے کہا۔ "مزید گفتگو سے پہلے یہ وڈیو کیسٹ دیکھ لیا جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ سامنے نصب ٹیلی ویژن پر چند لمحے آڑھی ترچھی لکیریں ابھرتی رہیں اور پھر تصاویر واضح ہوتی چلی گئیں۔

بانو یہ دیکھ کر غصے اور کرب سے کانپنے لگی کہ اس کے "پوتراشنان" کے دوران مختلف زاویوں سے اس کے جسم کی تصویریں اس طرح کمپوز کی گئی تھیں کہ فحاشی کا ایک منظر ابھرتا چلا گیا۔ وہ گپتا کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔

گپتا کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "شانتی دیوی! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس فلم کو تمہارے خلاف صرف اسی وقت استعمال کیا جائے گا جب تم ہمارے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کرو گی۔ یہ محض ایک احتیاطی تدبیر ہے ورنہ تم تو اس وقت گروہ کی انتہائی قابلِ احترام کارکن ہو۔ اس مشن کے دوران تمہاری ہر طرح حفاظت کی جائے گی۔ ہمارے آدمی ہر وقت تمہارے آس پاس ہوں گے۔ مجھے امید ہے تم ہماری توقعات کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔ دوسری صورت میں تمہارا حشر آشا سے بھی برا ہوگا۔"

گپتا کے آدمیوں نے چند ہی گھنٹے بعد شوبھا اور بانو کو تلک نگر کے ایک خوبصورت مکان میں پہنچا دیا۔ یہ متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ چاروں طرف چھوٹے مگر خوبصورت کوٹھی نما مکانات بنے ہوئے تھے۔ بانو یہ بھی جانتی تھی کہ شوبھا کو اس کی نگرانی کے لیے ساتھ رکھا گیا ہے۔ انہیں نئے ماڈل کی ایک "ماروتی" گاڑی ڈرائیور کے ساتھ فراہم کردی گئی تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر ڈاکٹر چندر بھان کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔

اس وقت وہ شوبھا کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھی۔ وہ پوتر پاپی گروہ کے ہیڈ کوارٹر سے باہر آنے پر بہت خوش تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب اسے مراد سے رابطہ کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی جہاں اوائلِ نومبر کی تھکی تھکی سی دھوپ اور بے جان مناظر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

سہ پہر کی چائے کے بعد اس نے ڈاکٹر چندر بھان کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب

ڈاکٹر ہی بات کر رہا تھا۔ "جی نمسکار' میرا نام شانتی ہے۔ شانتی ٹھاکر۔ آپ مجھ سے پہلے واقف نہیں 'مگر میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں؟"

بانو سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! بعض باتیں فون پر نہیں کی جاسکتیں.........." ڈاکٹر چندر بھان نے شام سات بجے کا وقت دے دیا۔

اپنے ڈرائیور راما سوامی کے ہمراہ وہ وقت مقررہ سے چند منٹ قبل ڈاکٹر چندر بھان کی رہائش گاہ سول لائنز پہنچ گئی۔ شوبھا' اسے ڈاکٹر کے حدود اربعہ سے آگاہ کر چکی تھی۔ ڈاکٹر چندر بھان ایم بی بی ایس تھا۔ اس کا باپ سورج بھان چودھری عرصہ دراز تک راجستھان کی صوبائی کابینہ میں شامل رہا تھا۔ چندر بھان نے بھی میڈیسن میں ڈگری لینے کے بعد سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا اور چند ہی برسوں میں راجستھان کی یوتھ کانگرس آئی کی صوبائی شاخ کی صدارت پر فائز ہوگیا۔

بانو گاڑی سے نیچے اتری تو سامنے ڈاکٹر کا سیکرٹری تنور سنگھ اس کے سواگت کے لیے موجود تھا جس نے اپنی رہنمائی میں اسے ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر بھی آن پہنچا۔ "مس شانتی ٹھاکر! آپ کس سلسلے میں مجھے ملنا چاہتی تھیں؟"

بانو نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ڈاکٹر صاحب پلیز! کچھ دھیرج سے کام لیں۔ آپ کے سبھی سوالوں کا جواب مل جائے گا۔" چندر بھان کسی قدر روکھے لہجے میں بولا۔ "شانتی دیوی! میں خاصا مصروف آدمی ہوں' مجھے امید ہے آپ تمہید میں وقت ضائع نہیں کریں گی۔" بانو کی آواز بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اس نے مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ "میرا تعلق ایک عرصے سے پوتر پاپی گروہ سے ہے اور اس کی سبھی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ اور کرنل بھوانی سنگھ جی گروہ کی موجودہ قیادت سے خوش نہیں' خود میں بھی گروہ کے قائدین سے ناراض ہوں۔ اس رشتے سے ہمارے درمیان دوستی کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔"

☆========☆========☆

مراد اور راجیو' بھوانی سنگھ کی رہائش گاہ پر انتخابی حکمت عملی طے کرنے میں مصروف تھے۔ فیصلہ ہوا کہ راجیو آخری لمحات میں بھوانی سنگھ کے حق میں الیکشن سے دست بردار ہوجائے گا تاکہ کرنل بھوانی سنگھ کے حق میں ایک نفسیاتی برتری کی فضا قائم ہو جائے۔ اچانک جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ "میں ایک بات آپ لوگوں کو بتانا بھول گیا۔ کل شام پوتر پاپی گروہ کی ایک کارکن عورت میرے پاس آئی تھی اور اس نے مجھے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔"

راجیو اور مراد پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ چندر بھان اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔ "اس کا نام شانتی ٹھاکر ہے اور........" بانو کا نام سن کر مراد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اپنے مزید اطمینان کے لیے وہ کہنے لگا۔ "چندر بھان جی! ہوسکتا ہے وہ گروہ کی ستائی ہوئی ہو۔ وہ ہم لوگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اس عورت کو ہماری موجودگی میں بلائیں تاکہ راجیو جان سکے کہ اس کی بیان کردہ کہانی میں کہاں تک صداقت ہے۔"

واپس گھر آتے ہوئے مراد اور راجیو خاصے مطمئن تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بانو کے ذریعے انہیں آشا اور سیوا رام کا معمہ حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے چندر بھان نے فون پر ان دونوں کو لنچ کی دعوت دی جس پر شانتی بھی مدعو تھی۔

مراد اور راجیو چندر بھان کے ہاں ٹھیک ڈیڑھ بجے پہنچ گئے۔ اسی وقت گیٹ سے سفید رنگ کی کار اندر داخل ہوئی اور وہ لمحہ آن پہنچا جس کا مراد کو شدت سے انتظار تھا۔ گاڑی سے اتر کر جونہی بانو برآمدے میں داخل ہوئی' اس کی نگاہیں کچھ دیر کے لیے ٹھٹک سی گئیں' مگر چند ہی ثانیوں میں اس نے اپنے اوپر قابو پالیا اور پُر اعتماد قدموں سے ان کی طرف بڑھی۔

چندر بھان نے ان کا تعارف بانو سے کرایا۔ "یہ مسٹر ارجن شرما ہیں اور یہ ہیں

راجیو' انہیں تو شاید آپ جانتی ہوں کیونکہ یہ بھی آپ کی طرح پوترپاپی گروہ کے پرانے کارکن رہے ہیں۔ آج کل ان سے کچھ باغی سے ہو رہے ہیں۔'' بانو نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا اور اپنی کسی حرکت سے چندربھان کو شبہ نہ ہونے دیا کہ وہ لوگ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

کچھ دیر بعد چندربھان اور نور سنگھ کھانے کا انتظام کرنے اندر چلے گئے تو ان تینوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ بانو نے مختصر الفاظ میں پوری بپتا سنا دی اور آشا اور سیوا رام کی حالتِ زار کا ذکر بھی کر ڈالا۔ راجیو اور مراد کو دلی صدمہ ہوا۔ تب ملازم نے انہیں ڈائننگ ہال میں آنے کی درخواست کی۔ وہ تینوں اسی ملازم کی رہنمائی میں کھانے کی میز تک پہنچے جہاں چندربھان ان کا منتظر تھا۔

کھانے کے دوران ہی ڈاکٹر کو کرنل بھوانی سنگھ کا پیغام آیا کہ وہ راجیو کو ساتھ لے کر فوراً اس کے ہاں پہنچے۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہوتے ہی روانہ ہوگئے۔ جانے سے پہلے ڈاکٹر نے مراد اور بانو کو تاکید کی کہ وہ اس کی واپسی تک یہیں ٹھہریں۔ وہ دونوں دل سے یہی چاہتے تھے۔ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پوری تفصیل سے اپنی اپنی کارگزاری ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

مراد نے بانو کو اس گروہ کی اصلیت سے آگاہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ اگر یہ دستاویزی ثبوت مل جائے کہ یہ گروہ بھارتی سرکار کا ذیلی ادارہ ہے اور اس کی تشکیل کا مقصد پاکستان میں دہشت گردی پھیلانا ہے' تو یہ بات پاکستان کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بانو بولی۔ ''مراد! ہمیں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہئے میری دانست میں ہر عمل جتنا بامقصد نظر آتا ہے' درحقیقت وہ اتنا ہی لایعنی ہوتا ہے۔ ہر عمل سے میرا یقین اٹھ سا گیا ہے۔ لگتا ہے میں اندر سے مرچکی ہوں۔

''مراد! اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ اپنے بھائی کی موت کا جلد سے جلد انتقام لے لوں۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اپنے بے گناہ بھائی کی قبر پر اس وقت تک نہیں جاؤں

گی جب تک اس کا قاتل میرے ساتھ نہیں ہوگا اور بھائی کی قبر کے سرہانے کھڑی ہو کر میں اس کے قاتل سے انتقام لوں گی۔''

مراد کو اس کی یہ خواہش بڑی عجیب سی لگی۔ ''بانو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''جناب مراد صاحب! عقلمندوں کی اس بھیڑ میں زندہ رہنے کے لئے تھوڑا سا پاگل پن ضروری ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ میں ترپاٹھی کو ظفر کی قبر پر کیسے لے جاسکتی ہوں۔''

مراد نے قدرے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بانو! تمہیں ترپاٹھی کا مکمل اعتماد حاصل کرنا ہوگا اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب اس کے لئے تم کوئی شاندار کارنامہ انجام دے چکی ہو۔''

واپس پہنچ کر بانو نے شوبھا کے ذریعے پاپی گروہ کے ہیڈکوارٹر کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس انتہائی اہم اور حساس معلومات ہیں' جنہیں وہ گروہ کے سربراہ ترپاٹھی تک پہنچانا چاہتی ہے۔

چند روز کی سوچ وچار کے بعد ترپاٹھی نے بانو سے ملنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ دونوں کے درمیان یہ ملاقات ہیڈکوارٹر میں ہوئی اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔

اپنے بھائی ظفر اقبال کے قاتل کو سامنے پاکر بانو کی آنکھوں میں خون اتر آیا' لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ ترپاٹھی کی آواز میں دنیا جہاں کی شفقت سمٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جو بانو کو متاثر کرنے لگی تھی۔ اپنے آپ کو بڑی جواں ہمتی سے سنبھالا دیا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''ترپاٹھی جی! مجھے راجیو اور ڈاکٹر بھان کی زبانی علم ہوا ہے کہ آپ کے قتل کی باقاعدہ سازش تیار کرلی گئی ہے اور اس میں گروہ کے چند سینئر ارکان بھی ملوث ہیں۔''

ترپاٹھی نے اس کی بات سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ ''لڑکی! تو میرا وقت ضائع کررہی ہے۔ اگر تو نے دوبارہ ایسی کہانی گھڑنے کی کوشش کی تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔'' بانو اس کی ڈانٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''مہاراج! میرا فرض آپ کو

خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کو پارسل کے ذریعے ایسا دھماکہ خیز مواد بھیجا جائے گا جو آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہوگا۔"

ترپاٹھی کو اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہ آیا' مگر اس نے شانتی کے پرخلوص جذبات کے پیش نظر کوئی سخت بات نہیں کی اور یوں یہ ملاقات محض دس منٹ جاری رہ کر ختم ہوگئی۔ اس ملاقات کے ایک ہفتے بعد گپتا جی روزمرہ آنے والی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران ان کی نظر ایک چھوٹے سے پارسل گفٹ پر پڑی جس پر نمایاں حروف میں تحریر تھا۔ "صرف دیوی پرشاد ترپاٹھی کے لئے۔"

گپتا جی نے اس پارسل کی بابت فوری طور پر ترپاٹھی کو مطلع کیا۔ جواب آیا پارسل کھول کر انہیں بھجوا دیا جائے۔ گپتا جی نے پارسل کھولنا شروع کر دیا۔ ناگاہ ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ پارسل میں لپٹا ہوا بم اتنا طاقتور تھا کہ اس نے گپتا کے جسم کو چشم زدن میں لوتھڑوں کا ایک ڈھیر بنا دیا۔ آفس کی چھت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی۔

پورے جے پور میں اس ہولناک سانحے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ترپاٹھی نے چند گھنٹوں بعد خود بانو کی رہائش گاہ پر جا کر اس کا شکریہ ادا کیا کہ تمہاری وجہ سے میری جان بچ گئی ہے۔ بانو کے علاوہ صرف مراد اور راجیو جانتے تھے کہ اس پارسل کو بھجوانے والا کون ہے۔ بانو کو شوبھا کی زبانی پتہ چلا کہ اس دھماکے کے فوراً بعد ترپاٹھی نے آشا اور سیوارام کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بانو نے یہ خبر راجیو سے پوشیدہ رکھی۔

اس واقعے کے بعد ترپاٹھی' بانو پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا اور اسے گروہ میں غیر اعلانیہ طور پر ترپاٹھی کے نمبر ٹو کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ گروہ کے سینئر ارکان بانو کی اس قدر حوصلہ افزائی پر بہت ناخوش تھے' مگر تنقید کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔ دوسری جانب جوں جوں الیکشن کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی' دونوں فریقوں میں تلخی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جے پور کا سیاسی ماحول انتہائی کشیدہ ہو چکا تھا۔

مراد اور راجیو کے روابط کانگرس آئی کے مقامی لیڈروں سے روز بروز بہتر ہوتے

جا رہے تھے اور اب انہیں بانو سے ملنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ آخرکار مراد اور راجیو نے آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ راجیو' آشا کی المناک موت سے آگاہ ہونے کے بعد ترپاٹھی کی مخالفت میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا' چنانچہ ان تینوں نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ء کو بانو نے فون پر ترپاٹھی سے ملاقات کا وقت مانگا جو اسے فوری طور پر مل گیا۔ ترپاٹھی نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی کوٹھی میں کسی قسم کی چہل پہل یا شور وغل کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ نوکر کے ہمراہ رہتا اور اپنے ڈرائنگ روم کو اسٹڈی روم کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

ترپاٹھی نے بڑی خوشدلی سے شانتی کا استقبال کیا۔ لگتا تھا وہ ابھی پوجا پاٹھ سے فارغ ہوا ہے۔ اپنے ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر وہ بانو کی جانب متوجہ ہوا۔ "آؤ شانتی آؤ! آج تو تم بڑی نکھری نکھری سی لگ رہی ہو۔" بانو اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ "ہاں ترپاٹھی جی! آج میں واقعی خود کو بھی نکھری سی لگ رہی ہوں۔ ویسے شاید نکھرنے اور بکھرنے کا بھی آپس میں کوئی گہرا تعلق ہے؟"

ترپاٹھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "شانتی! کبھی کبھی تم خاصی گہری باتیں کرنے لگتی ہو۔ ویسے بائی دے وے تم کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟" بانو شگفتہ انداز میں مسکرائی۔ "ترپاٹھی جی! چھوڑیں پڑھائی کی باتیں' ویسے ایک بات یاد رکھیں۔ دانش یا حماقت کسی ڈگری کی محتاج نہیں۔ میں بہت سادہ دل ہوں اگر تھوڑی سی مزید سادہ ہوتی تو یقیناً بیوقوف کہلاتی۔" ترپاٹھی اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ شانتی! وشواس کرو اگر کہیں تم دس بیس سال پہلے مل جاتیں تو یقیناً تم سے شادی کر لیتا۔ ویسے اس آئیڈیا پر آج بھی غور کیا جا سکتا ہے۔"

بانو شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ "اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال تو میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔" ترپاٹھی بھی پوری طرح سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" بانو مستحکم لہجے میں بولی۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ کرنل بھوانی سنگھ اور راجیو آپ کے خلاف کوئی نئی سازش تیار کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ان کا الور آنا جانا رہتا ہے۔" ترپاٹھی نے پوچھا۔ "الور جانے سے ان کا کیا مقصد؟" بانو بولی۔ "مجھے یہ تو علم نہیں مگر ان کی بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پُراسرار سرگرمیوں کا تعلق الور کے نواح میں واقع کالی ماتا کے مندر سے ہے جہاں وہ دونوں تقریباً ہر دوسرے روز جاتے ہیں۔"

ترپاٹھی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے۔ میں الور کئی سال رہ چکا ہوں۔ وہاں ایسی کوئی پوشیدہ جگہ نہیں 'کالی ماتا کے مندر میں جاکر دیکھنا ہوگا کہ ان لوگوں نے وہاں کون سا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں وہاں کل ہی جاتا ہوں۔"

شانتی بولی۔ "نہیں' میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی بلکہ خود بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" ترپاٹھی اس کے خلوص سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ "ارے بھئی! تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ میں وہاں اکیلا جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ میرے تین چار باڈی گارڈز ہوں گے۔" شانتی اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "لعنت بھیجیں ان باڈی گارڈز پر۔ جب کوئی مصیبت آن پڑے تو دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ میں خود آپ کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔"

ترپاٹھی نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم چلوگی تو اور بھی اچھا ہوگا تب ان لوگوں کو ساتھ لے جانا ویسے بھی مناسب نہیں رہے گا۔" شانتی بولی۔ "تو پھر ہم کل کس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے؟" ترپاٹھی کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہاں سے کل سہ پہر تین بجے چلیں گے اور شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ رات وہیں بسر کرکے پرسوں لوٹ آئیں گے۔" بانو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

۱۶ دسمبر کی سہ پہر وہ دونوں ترپاٹھی کی مرسڈیز گاڑی میں الور کے لیے روانہ ہوئے۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اور سردی میں خاصی شدت آچکی تھی۔ الور پہنچتے تک سائے ڈھل گئے تھے اور شام کی آمد آمد تھی۔ شہر کو بائیں جانب چھوڑتے ہوئے وہ کالی ماتا کے مندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ترپاٹھی نے گاڑی کے اندر ہی خاصی مقدار میں شراب کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور سارے راستے وقفے وقفے سے اسے اپنے معدے میں انڈیل چکا تھا' مگر اس کے حواس پوری طرح قائم تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرانا پینے والا ہے۔ الور کی سرسبز پہاڑیوں کے دامن سے گزرتے ہوئے اس نے شاعری کرنے کی کوشش کی۔ "شانتی ڈیئر! بھگوان کرے ہمارا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو!"

بانو کی آواز میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ "ترپاٹھی جی! کسی کا بھی سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہر شخص ہر دم سفر میں ہوتا ہے۔ کبھی ماضی کی طرف اور کبھی آنے والے زمانوں کی جانب۔ اب پتہ نہیں ہمارا یہ سفر ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟" ترپاٹھی اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "جے پور میں آج تک مجھے کم ہی ایسی عورتیں نظر آئی ہیں جنہیں خوبصورت کہا جاسکے۔ اجڑی ہوئی شکلیں' ساڑھی کی گرفت سے نکلتے ہوئے بے ڈھنگے پیٹ۔ ایسے حالات میں تم جیسی سندر ناری کا ساتھ غنیمت ہی نہیں' مالِ غنیمت ہے۔"

اس کی بیہودہ گوئی سن کر بانو کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "ابھی کالی ماتا کا مندر کتنی دور ہے؟" ترپاٹھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "زیادہ دور نہیں۔ آگے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا ایک پرانا قبرستان ہے اسی سے ملحقہ یہ مندر ہے۔" بانو دھیرے سے بڑبڑائی۔ "تو کیا بھارت میں ابھی تک مسلمانوں کے قبرستان موجود ہیں؟" ترپاٹھی کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔ "شانتی جی! بھارت دیش میں اب مسلمانوں کی قبریں ہی زندہ رہ گئی ہیں۔ باقی مسلمان تو زندہ لاشیں ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو یہ قبریں بھی مٹادی جائیں گی۔"

ابھی بانو اس کی بات پر غور کر ہی رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھا۔ "لو وہ سامنے قبرستان آگیا۔" بانو کی تمام حسیات اچانک بیدار ہو گئیں۔ وہ تقریباً چلا اٹھی۔ "ترپاٹھی جی! یہیں گاڑی روک لیں۔ میں ذرا دیکھنا چاہتی ہوں کہ قبرستان کیسے ہوتے ہیں۔" ترپاٹھی نے اس کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھا' مگر اس نے گاڑی ایک جانب کچے میں اتار کر روک لی۔ بانو نے میکانکی انداز میں دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ قبرستان بہت وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک ٹوٹی اور ویران قبروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وسعت اور ویرانی لازم و ملزوم ہیں۔ وہ ایک جانب کھڑی ہو کر جانے کن خیالوں میں کھو گئی۔ بانو کو یوں لگا جیسے وہ ہمیشہ سے یہیں رہتی ہے اور اس کا اکلوتا ماں جایا یہیں کسی قبر میں ہمیشہ کے لیے سو رہا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک قبر کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔

تھوڑا آگے بڑھی تو ایک مزار نما قبر دکھائی دی۔ ملحقہ ٹوٹی ہوئی مسجد مزار سے زیادہ اجڑی ہوئی تھی۔ شکستہ دیوار پر بیٹھا تنہا پرندہ اسے مزار کا متولی معلوم ہوا۔ اسی اثناء میں ایک گنوار سا ہندو آیا۔ دھوتی' چٹیا والے اس ہندو نے مزار کے سامنے مئودب ہو کر نمسکار کیا۔ ہاتھ جوڑ قبر کو بوسہ دیا' دعا مانگی اور چلتا بنا۔ بانو اس کی دعا نہیں سن سکی' مگر بے اختیار اس کے منہ سے آمین نکل گئی۔

ترپاٹھی کار کے پاس کھڑا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور بانو کے کندھے کو زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔ "شانتی! یہ کیا پاگل پن ہے! چلو گاڑی میں بیٹھو شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔" بانو شاید اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ترپاٹھی کے پاؤں پکڑتے ہوئے بولی۔ "ترپاٹھی جی! تین سال پہلے آپ نے الور جیل میں جن دو پاکستانیوں کو جان سے مارا تھا' ان کی قبریں کہاں ہیں؟ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے ان کا پتہ بتا دیں تاکہ میں وہاں فاتحہ پڑھ سکوں۔ اپنے بھائی کو بتا سکوں کہ بوڑھی ماں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ ظفر اقبال کو کہنا کہ اپنی

چھوٹی بہنوں کا خیال رکھے' مگر وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر اس شہرِ خموشاں میں آبسا۔"

ترپاٹھی بری طرح چونکا۔ عشق کا بھوت اس کے سر سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے بہت بڑے خطرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے بانو کو دھکے سے پرے پھینکا اور اپنی گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا ہو گا کہ برگد کے بڑے سے پیڑ سے کوئی چیز دھپ سے اس پر آن پڑی۔ خوف کے مارے اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اس نے اپنے اوپر گرنے والی چیز سے جان چھڑانے کی کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ چند لمحوں بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی شخص رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا ہے۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ معمولی سی بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

مراد اور راجیو نے ترپاٹھی کو باندھنے کے بعد بانو کو اٹھایا جو ایک قبر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے حواس میں آگئی۔ مراد' ترپاٹھی کے سامنے پہنچا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ترپاٹھی جی! آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں' تین سال پہلے الور جیل میں آپ نے بے بس پاکستانیوں پر جو ظلم کیا تھا' آج اسی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔" وہ دونوں اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے اٹھا کر ایک جانب چل پڑے۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔ "مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔" کوئی جواب دیے بغیر وہ آگے بڑھتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بانو بھی آ رہی تھی۔

خاصی دور جا کر انہوں نے ترپاٹھی کو ایک تازہ کھدی قبر کے قریب پٹک دیا۔ ترپاٹھی پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا اور اسے آنے والے لمحات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا' مراد کا لہجہ حد درجہ کھردرا تھا۔ "مسٹر ترپاٹھی! رونا دھونا فضول ہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو تم نے جس کھیل کا آغاز الور جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کیا تھا' آج اس کا ڈراپ سین تمہیں اس قبر میں زندہ دفنانے کے ساتھ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اسے قبر کے گڑھے میں پھینک دیا۔ رات کی تاریکی ہر شے کو اپنے اندر سمیٹ چکی تھی۔ ترپاٹھی کی آخری چیخیں اس قدر ہولناک تھیں کہ چند لمحوں کے

لیے مراد بھی اداس ہوگیا' البتہ بانو کے چہرے پر ملال کے آثار بالکل نہیں تھے۔ اوپر سے مٹی برابر کرنے کے بعد وہ ترپاٹھی کی کار میں بیٹھ کر دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆========ختم شد========☆